# جلوہ ایثار

منشی پریم چند



# جلوۂ ایثار

## 1

وندھیا چل پہاڑ آدھی رات کی ڈراؤنی تاریکی میں کالے دیو کی طرح کھڑا تھا۔ اس پر اگے ہوئے چھوٹے چھوٹے درخت ایسے نظر آتے تھے گویا کہ اس کی جٹائیں ہیں اور اشٹ بھجی دیوی کا مندر جس کے کلس پر سیاہ پتا کے ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے لہرا رہے تھے، اس دیو کا سر معلوم ہوتا تھا۔ مندر میں ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ نظر آتا تھا جس پر کسی دھندلے تارے کا گمان ہوتا تھا۔

آدھی رات گزر چکی تھی، چاروں طرف ہیبت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گنگا جی کی سیاہ لہریں پہاڑ کے نیچے سکون بخش روانی سے بہہ رہی تھیں اور ان کے بہاؤ سے ایک دلآویز نغمہ کی صدا نکل رہی تھی۔ جا بجا کشتیوں پر اور کناروں کے آس پاس ملاحوں کے چولہوں کی آنچ نظر آ جاتی تھی۔ ایسے وقت میں ایک سفید پوش عورت اشٹ بھجی دیوی کے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھی تھی۔ اس کا متین چہرہ زرد تھا اور بشرے سے شرافت برستی تھی۔ اس نے دیر تک سر جھکانے کے بعد کہا:

ماتا! ”آج بیس سال سے کوئی منگل کا دن ایسا نہیں گزرا کہ میں نے چرنوں میں سر نہ جھکایا ہو۔ ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ میں نے تمہارے چرنوں کا دھیان نہ کیا ہو۔ تم جگ تارنی مہارانی ہو، مگر تمہاری اتنی سیوا کرنے پر بھی میرے دل کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ میں تمہیں چھوڑ کر اب کہاں جاؤں؟“

ماتا! میں نے سینکڑوں برت رکھے۔ دیوتاؤں کی اپاسنائیں کیں، تیرتھ جاترائیں کیں مگر منورتھ پورا نہ ہوا۔ تب تمہارے شرن آئی۔ اب تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ تم نے سدا اپنے بھگتوں کی مرادیں پوری کی ہیں۔ کیا میں تمہارے دربار سے نراش جاؤں؟

سبایا اسی طرح دیر تک بنتی کرتی رہی کہ یکایک اس کے دل پر بے خبر کر دینے والی

محویت کا غلبہ ہوا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور کان میں آواز آئی۔

''سباما! میں تجھ سے بہت خوش ہوں، مانگ کیا مانگتی ہے''

سباما کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور کلیجہ دھڑ کنے لگا کہ آج بیس سال کے بعد مہارانی نے روشن دیئے۔ کانپتے ہوئے بولی۔

''جو کچھ مانگوں گی وہ مہارانی دیں گی؟''

''ہاں ملے گا''

''میں نے بھاری تپسیا کی ہے، اس لیے بڑا بھاری بر دان مانگوں گی''

''کیا لے گی؟ کبیر کا دھن؟''

''نہیں''

''اندر کا بل؟''

''نہیں''

''سرسوتی کی ودیا؟''

''نہیں''

''سنسار کا سب سے اتم پدارتھ؟''

''نہیں''

''وہ کیا ہے؟''

''سپوت بیٹا''

''جو کل کا نام روشن کرے''

''نہیں''

''جو ماں باپ کی سیوا کرے''

''نہیں''

''جو ودیاوان اور بلوان ہو؟''

’’نہیں‘‘

’’پھر سپوت بیٹا کسے کہتی ہے؟‘‘

’’جو اپنے دیش کا اپکار کرے‘‘

’’تیری بدھی کو دھنیہ ہے۔ جا تیری اچھا پوری ہوگی‘‘

## 2

## ویراگ

منشی سالگرام بنارس کے پرانے رئیس تھے۔ پیشہ وکالت کا اور موروثی جائیداد افر تھی، وسا سمیدھ گھاٹ پر ان کا عالیشان مکان آسمان سے باتیں کرتا تھا۔ فیاض ایسے کے پچیس تیس ہزار سالانہ کی آمدنی خرچ کو کافی نہ ہوتی۔ سادھوؤں اور برہمنوں کے پکے معتقد تھے۔ جو کچھ کماتے برہم بھوج اور سادھوؤں کی تواضع وتکریم میں صرف ہو جاتا۔ شہر میں کوئی سادھو آ جائے، کوئی مہاتما آ جائے، وہ منشی جی کا مہمان تھا۔ سنسکرت کے ایسے عالم کہ بڑے بڑے پنڈت ان کا لوہا مان چکے تھے۔ ویدانت کے اصولوں کے پابند تھے اور طبیعت کا میلان ویراگ کی طرف تھا۔

منشی جی کو فطرتاً بچوں سے بہت انس تھا۔ جب وہ گھر سے نکلتے تو قدرتی بچوں کا ایک لشکر ساتھ ہوتا۔ ایک بار ایک سنگدل ماں اپنے بچے کو مار رہی تھی۔ لڑکا بلک بلک کر روتا تھا۔ منشی جی سے ضبط نہ ہو سکا۔ بچے کو گود میں اٹھا لیا اور عورت کے سامنے اپنا سر جھکا لیا۔ اس دن سے اس نے لڑکے کو مارنا چھوڑ دیا اور نہ مارنے کی قسم کھالی۔ جو شخص غیروں کا ایسا دلدادہ ہو وہ اپنے بچے کو کتنا پیار کرے گا۔ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب سے بچہ پیدا ہوا منشی جی دنیا کے کاموں سے کنارہ کش ہو گئے۔ کہیں ہنڈولے میں جھلا رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں۔ کہیں اسے خوشنما سیر گاڑی میں بٹھا کر خود کھینچ رہے ہیں۔

سہاما نے لڑکے کا نام پرتاب چندر رکھا تھا اور جیسا اس کا نام تھا، ویسے ہی اس کے

اوصاف تھے۔ بلا کا ذہین، نہایت خوش رو باتیں کرتا تو سننے والے محو ہو جاتے۔ ستارۂ بلندی پیشانی پر چمکتا تھا۔ اعضاء ایسے قوی کہ دو گنے قد و قامت کے لڑکوں کی کچھ حقیقت نہ سمجھتا۔ اس کمسنی میں اس کا چہرہ ایسا روشن اور متین تھا کہ یکا یک کسی غیر شخص کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا تو وہ حیرت سے تکنے لگتا تھا۔

اس طرح ہنستے کھیلتے چھ برس گزر گئے۔ عیش کے دن ہوا کی طرح سن سے گزر جاتے ہیں، کہ خبر نہیں ہوتی۔ وہ سیاہ بختی کے دن اور مصیبت کی راتیں جو کاٹے نہیں کٹتیں، آ گئیں۔ پرتاپ کے پیدا ہوئے ابھی کتنے دن گزرے! مبارکبادی کی دلآویز صدائیں کانوں میں گونج ہی رہی تھیں کہ چھٹی سالگرہ آپہنچی اور چھٹے سال کا خاتمہ برے دنوں کا آغاز تھا۔ منشی سالگرام کا دنیاوی تعلق محض نمائشی تھا۔ وہ بے لوث اور بے لگاؤ زندگی بسر کرتے تھے۔ اگر چہ ظاہر بیں نگاہوں میں معمولی دنیا داروں کی طرح دنیا کی کلفتوں سے رنجیدہ اور خوشیوں سے خوش نظر آتے تھے۔ مگر ان کا دل ہمیشہ اس اعلیٰ اور پرسکون امن کے مزے لیا کرتا تھا جس پر رنج کے جھونکوں اور خوشی کی تھپکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ماگھ کا مہینہ تھا۔ الہ آباد میں کنبھ کا میلا تھا۔ ریل گاڑیوں میں جاتری روئی کی طرح بھر بھر کر الہ آباد پہنچائے جا رہے تھے۔ اسی اسی برس کے بڈھے جنہیں برسوں سے اٹھنا دوبھر تھا، لنگڑاتے، لاٹھیاں ٹیکتے منزلیں طے کر کر کے پریاگ راج کو جا رہے تھے۔ بڑے بڑے سادھو مہاتما جن کے درشنوں کی خواہش لوگوں کو ہمالیہ کی تاریک گھپاؤں میں کھینچ لے جاتی تھی، اس وقت گنگا جی کی پاک لہروں سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ منشی سالگرام کا بھی جی للچایا۔ سبھاما سے بولے ''کل اشنان ہے''

سبھاما: ''سارا محلّہ سونا ہو گیا ہے، کوئی آدمی نظر نہیں آتا''

منشی: ''تم چلنے پر راضی نہیں ہوتیں ورنہ بڑا لطف آتا۔ ایسا میلہ تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا''

سباما: ''ایسے میلوں سے میرا جی گھبراتا ہے''

منشی: ''میرا جی نہیں چاہتا۔ جب سے سنا ہے کہ سوامی پرمانند جی آئے ہوئے ہیں۔ میرا تو دل ان کے درشن کے لیے بے قرار ہے''

سباما پہلے تو ان کے جانے پر راضی نہ ہوئی مگر جب دیکھا کہ یہ روکے نہیں رکیں گے تب مجبوراً مان گئی۔ اسی دن گیارہ بجے رات کو منشی جی پریاگ راج چلے۔ چلتے وقت پرتاپ کا بھوسہ لیا اور بیوی کو پیار سے گلے لگالیا۔ سباما نے اس وقت دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ جیسے چیت کے مہینے میں کالی کالی گھٹاؤں کو دیکھ کر کسان کا کلیجہ کانپنے لگتا ہے، اسی طرح منشی جی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر سباما لرز گئی۔ آنسو کی وہ بوندیں ویراگ اور تیاگ کا اتھاہ سمندر تھیں۔ دیکھنے میں وہ کیسے ننھے پانی کے قطرے تھے مگر کیسے گہرے! اور کیسے وسیع! ادھر منشی جی باہر نکلے اور سباما نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ کسی نے اس کے دل میں کہا کہ اب تجھے اپنے پتی کے درشن نہ ہوں گے۔ دو دن گزر گئے۔ تین دن گزرے۔ چوتھا دن آیا اور چلا گیا۔ یہاں تک کہ پورا ایک ہفتہ گزر گیا، اور منشی جی نہ لوٹے، تب تو سباما کو بے کلی ہونے لگی۔ تار دیئے۔ آدمی دوڑائے، مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ دوسرا ہفتہ بھی دوا دش میں ختم ہو گیا اور منشی جی کی واپسی کی جو کچھ رہی سہی امیدیں تھیں خاک میں مل گئیں۔

منشی جی کا مفقود الخبر ہونا نہ صرف ان کے خاندان بلکہ سارے شہر کے لیے افسوسناک واقعہ تھا۔ بازاروں میں، دکانوں میں، نشست گاہوں میں غرض ہر چار طرف یہی مرکز گفتگو تھا۔ جو سنتا افسوس کرتا۔ کیا امیر کیا غریب یہ ماتم عام تھا۔ ان کی ذات سے چاروں طرف جو زندہ دلی پھیلی رہتی تھی۔ اب ایک ماتم چھایا ہوا تھا۔ جن گلیوں سے وہ بچوں کی فوج لے کر نکلتے تھے وہاں اب خاک اڑ رہی تھی۔ بچے بار بار ان کے پاس آنے کے لیے روتے اور ضد کرتے۔ ان بے چاروں کو کیا خبر تھی کہ اب

وہ محفل ویران ہوگئی۔ ان کی مائیں آنچل سے منہ ڈھانپ کر روتیں۔ جیسے ان کا کوئی عزیز مر گیا ہو۔

یوں تو منشی جی کے غائب ہونے کا رونا سب ہی رو رہے تھے۔ مگر سب سے گاڑھے آنسو آڑھتیوں اور سوداگروں کی آنکھوں سے نکلتے تھے جن کا ابھی حساب کتاب نہیں ہوا تھا۔ دس بارہ دن تو انہوں نے جوں توں کر کے صبر کیا۔ مگر آخر کب تک؟ ایک ایک کر کے حساب کی فردیں پیش ہونے لگیں۔ کبھی برہم بھوج میں دو سو روپیہ کا گھی آیا ہے اور قیمت نہیں دی گئی ہے۔ کہیں سے دو من میدہ آیا ہوا ہے۔ مندر بنواتے وقت ایک مہاجن سے بیس ہزار روپیہ قرض لیا گیا تھا، وہ ابھی جوں کا توں پڑا ہوا ہے۔ مطالبات کا تو یہ حال تھا اور اثاثہ کا یہ حال تھا کہ بجز ایک عالیشان عمارت اور اس کے لوازمات کے کوئی ایسی جائیداد نہ تھی جس سے کوئی کثیر رقم کھری ہو سکے۔ تدبیر یہ تھی کہ علاق نیلام پر چڑھایا جائے اور اس کے محاصل سے مطالبات ادا کیے جائیں۔

بے چاری سباما سر جھکائے بورے پر بیٹھی ہوئی تھی اور پرتاپ چند اپنے لکڑی کے گھوڑے پر سوار آنگن میں ٹخ ٹخ کر رہا تھا کہ پنڈت موٹے رام شاستری جو خاندان کے پروہت تھے، مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ انہیں خوش دیکھ کر مایوس سباما چونک کر اٹھ بیٹھی کہ شاید کوئی خوشخبری لائے ہیں۔ ان کے لیے آسن بچھایا اور پرامید نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ پنڈت جی آسن پر بیٹھے اور سونگھنی سونگھتے ہوئے بولے۔ ''تم نے مہاجنوں کا حساب دیکھا؟''

سباما: (مایوسانہ لہجے میں) ''ہاں دیکھا تو''

موٹے رام: ''رقم بڑی گہری ہے۔ منشی جی نے آگا پیچھا کچھ نہ سوچا۔ اپنے یہاں کوئی حساب کتاب نہ رکھا۔''

''ہاں اب تو رقم گہری ہے نہیں تو اتنا روپیہ ایک ایک بھوج میں اٹھ گیا کیا؟''

موٹے رام: ''سب دن برابر نہیں جاتے''

سباما: ''اب تو جو ایشور کرے گا وہ ہوگا، میں کیا کر سکتی ہوں''

موٹے رام: ''ہاں ایشور کی اچھا تو مول ہی ہے۔ مگر تم نے بھی کچھ سوچا ہے؟''

سباما: ''ہاں علاقہ نیلام کر دوں گی''

موٹے رام: ''رام رام یہ کیا کہتی ہو علاقہ بک گیا تو پھر بات کیا رہ جائے گی''

سباما: ''اس کے سوا اب کوئی تدبیر نہیں ہے''

موٹے رام: ''بھلا علاقہ ہاتھ سے نکل گیا تو تم لوگوں کا گجر بسر کیسے ہوگا؟''

سباما: ''ہمارا ایشور مالک ہے، وہی بیڑا پار کرے گا''

موٹے رام: ''یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسے اپکاری آدمی کے لڑکے بالے دکھ اٹھائیں''

سباما: ''ایشور کو یہی منظور ہے تو کسی کا کیا بس؟''

موٹے رام: ''بھلا میں ایک جگت بتاؤں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے''

سباما: ''ہاں بتایئے آپ کا بڑا اپکار ہوگا''

موٹے رام: ''پہلے تو ایک درکھاس لکھوا کر کلکٹر صاحب کو دے دو کہ مالگجاری معاف کی جائے۔ باقی روپیہ کا بندوبست ہمارے اوپر چھوڑ دو، ہم جو چاہیں گے کریں گے، مگر علاقے پر آنچ نہ آنے پائے گی''

سباما: ''کچھ معلوم ہو تو آپ اتنا روپیہ کہاں سے لائیں گے؟''

موٹے رام: ''تمہارے لیے روپیہ کا کلیان، منشی کے نام پر بنا لکھا پڑھی کے پچاس ہزار روپیہ کا بندوبست ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ روپیہ لکھا ہوا ہے تمہارے منہ سے ہاں نکلنے کی دیر ہے''

سباما: ''شہر کے رئیسوں نے جمع کیا ہوگا''

موٹے رام: ''ہاں بات کی بات میں روپیہ جمع ہو گیا۔ صاحب کا اشارہ بہت تھا''

سباما: (کچھ سوچ کر) ''معافی کی درخواست مجھ سے نہ لکھوائی جائے گی اور نہ اپنے پتی کے نام پر قرض لینا چاہتی ہوں، میں سب کا ایک ایک پیسہ علاقہ سے ادا کروں گی''

یہ کہہ کر سباما نے رکھائی کے ساتھ منہ پھیر لیا، اور اس کے زرد اور افسوسناک چہرے پر ہلکا سا غصہ دکھائی دیا۔ موٹے رام نے دیکھا بات بگڑا چاہتی ہے تو سنبھل کر بولے۔

''اچھی جیسی تمہاری مرضی، اس میں کوئی جبر دتی نہیں ہے۔ مدا ہم نے تم کو کسی طرح کا دکھ اٹھاتے دیکھا تو اس دن پرلے ہو جائے گا، بس اتنا سمجھ لو''

سباما: ''تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنے پتی کے نام پر دوسروں کے احسان کا بوجھ رکھوں۔ میں اسی گھر میں مروں گی، فاقے کرتے کرتے مر جاؤں گی، مگر کسی کا احسان نہ اٹھاؤں گی''

موٹے رام ''چھی چھی! تمہارے اوپر احسان کون کرتا ہے، کیسی بات منہ سے نکالتی ہو؟ کرج لینے میں کوئی سرم نہیں ہے۔ کون رئیس ہے جس پر لاکھ دو لاکھ کا کرج نہ ہو''

سباما: ''مجھے یقین نہیں آتا کہ اس قرض میں احسان شامل نہیں ہے''

موٹے رام: ''سباما! تمہاری بدھی کہاں گئی ہے، بھلا تم سب طرح کے دکھ اٹھا لو گی، مگر کیا تمہیں اس بالک پر ترس نہیں آتا''

موٹے رام کی یہ چوٹ کاری پڑی۔ سباما آب دیدہ ہو گئی اور بیٹے کی طرف پر حسرت نگاہوں سے دیکھا۔ اس بچے کے لیے کون کون سی تپسیا نہیں کی۔ کیا اب اس کی تقدیر میں دکھ اٹھانا لکھا ہے۔

جو پودا کل ہوا کے تیز جھونکوں سے بچایا جاتا تھا، جس پر کبھی آفتاب کی تیز کرنیں نہ

پڑنے پاتی تھیں، جو تر تازگی کے ہنڈولے میں جھول رہا تھا۔ کیا وہ آج اس جلتی ہوئی دھوپ اور اس آگ کی لپیٹ میں مرجھا جائے گا۔ سباما کئی منٹ تک اسی فکر میں بیٹھی رہی۔ موٹے رام دل میں خوش ہو رہے تھے کہ اب بازی مار لی۔ اتنے میں سباما نے سر اٹھایا اور بولی۔ ''جس کے باپ نے لاکھوں کو پلایا کھلایا وہ دوسروں کی آسریت نہیں بن سکتا۔ اگر آپ کا دھرم اس کی مدد کرے گا تو وہ خود دس کو کھلا کر کھائے گا (لڑکے کو بلاتے ہوئے) بیٹا ذرا ادھر یہاں آؤ۔ کل سے تمہاری مٹھائی بند، دودھ گھی سب بند ہو جائے گا، روؤ گے تو نہیں'' یہ کہہ کر اس نے بیٹے کو پیار سے گود میں بٹھایا اور اس کے گلابی رخساروں سے پسینہ پونچھ کر ایک بوسہ لیا۔

پرتاپ: ''کیا کہا کل سے مٹھائی بند ہو گی۔ کیوں، کیا حلوئی کی دوکان میں مٹھائی نہیں ہے؟''

سباما: ''مٹھائی تو ہے مگر اس کا روپیہ کون دے گا؟''

پرتاپ: ''ہم بڑے ہوں گے تو اس کو بہت روپیہ دیں گے۔ چل ٹخ ٹخ دیکھوں اماں کیسا تیز گھوڑا ہے'' سباما کی آنکھوں میں پھر آنسو اُمڈ آئے، افسوس! کیا اس حسن و نزاکت کے پتلے پر ابھی سے افلاس کی مصیبتیں آ جائیں گی۔ نہیں نہیں، میں خود سب بھگت لوں گی مگر اپنے پیارے بچے پر مصیبت کی پرچھائیں نہ آنے دوں گی۔ ماں تو یہ خیال کر رہی تھی اور پرتاپ اپنے منہ زور بد لگام اسپ چوبیں کو زیر کرنے میں ہمہ تن مصروف تھا۔ بچے تو ہوتے ہیں دل کے بادشاہ! الغرض موٹے رام نے بہت کچھ جال پھیلایا۔ اور بہت فصاحت و بلاغت صرف کی مگر سباما نے ایک دفعہ نہیں کر کے ہاں نہ کی۔ اس کی وضعداری کا تذکرہ جس نے سنا واہ واہ کی۔ لوگوں کے دل و دماغ میں اس کی عزت دوچند ہو گئی۔ اس نے وہی کیا جو ایسے سیر چشم اور دریا دل آدمی کی بیوی کے شایانِ شان تھا۔

اس کے پندرہویں دن علاقہ نیلام پر چڑھا۔ پچاس ہزار کی رقم وصول ہوئی، کل

مطالبے چکا دیئے گئے، گھر کا بے ضرورت سامان فروخت کر دیا گیا۔ مکان میں بھی سباما نے اندر سے اونچی اونچی دیواریں کھنچوا کے دو علیحدہ درجے کیے۔ ایک میں خود رہنے لگی اور دوسرا کرایہ پر اٹھا دیا۔

## 3

## نئے پڑوسیوں سے میل جول

منشی سنجیون لال جنھوں نے سباما کا مکان کرایہ پر لیا تھا، اعلیٰ درجہ کے روشن خیال آدمی تھے۔ پہلے ایک سرکارہ عہدہ پر ممتاز تھے۔ مگر اپنی آزاد طبیعت کے باعث افسروں کو خوش نہ رکھ سکے۔ یہاں تک کہ ان کی ناراضگی سے تنگ آ کر استعفیٰ دے دیا۔ دوران ملازمت تھوڑا سا سرمایہ فراہم کر لیا تھا، نوکری چھوڑتے ہی ٹھیکہ داری کی طرف رجوع کیا اور اپنی محنت و جانفشانی سے تھوڑے ہی عرصہ میں اچھی حالت بنا لی۔ اس وقت ان کی آمدنی چار پانچ سو کی اوسط سے کم نہ تھی۔ ایسی معاملہ فہم طبیعت پائی تھی کہ جس تعمیر میں ہاتھ لگاتے نفع کے سوا نقصان نہ ہوتا۔

منشی سنجیون لال کا کنبہ بہت بڑا نہ تھا۔ اولادیں تو ایشور نے کئی دیں مگر وہ سب بچپنے میں ہی داغ مفارقت دے گئیں تھیں۔ اب اس وقت ماں باپ کی آنکھوں کی پتلی صرف ایک لڑکی تھی۔ اس کا نام برج رانی تھا اور وہی والدین کی زندگی کا سہارا تھا۔

پرتاپ چند اور برج رانی میں پہلے ہی دن سے دوستی شروع ہو گئی۔ آدھ گھنٹے میں دونوں چڑیوں کی طرح چہکنے لگے۔ برجن نے اپنی گڑیاں، کھلونے اور باجے دکھائے اور پرتاپ نے اپنی کتابیں، قلم اور تصویریں پیش کیں۔ برجن کی ماں سوشیلا نے پرتاپ کو گود میں لے لیا اور خوب پیار کیا۔ اس دن سے وہ روز شام کو آتا۔ دونوں ہمجولی ساتھ ساتھ کھیلتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں بھائی بہن ہیں۔ سوشیلا دونوں بچوں کو گود میں اٹھا لیتی اور ان کو گھنٹوں پیار کرتی اور گھنٹوں ٹکٹکی لگائے دونوں

بچوں کو دیکھا کرتی۔ برجن بھی پرتاپ کے گھر کبھی کبھی جاتی۔ مصیبت کی ماری سباما اسے دیکھ کر اپنی مصیبت بھول جاتی۔ اسے چھاتی سے لگا لیتی اور اس کی بھولی بھالی باتیں سن کر اپنا غم غلط کرتی۔

ایک روز منشی سنجون لال باہر سے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پرتاپ اور برجن دونوں دفتر میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پرتاپ کوئی کتاب پڑھ رہا ہے اور برجن دھیان لگائے سن رہی ہے۔ دونوں نے جونہی منشی جی کو دیکھا اٹھ کھڑے ہوئے۔ برجن تو دوڑ کر باپ کی گود میں جا بیٹھی اور پرتاپ سر نیچا کر کے کھڑا ہو گیا۔ کیسا ذی شعور لڑکا تھا۔ سن ابھی آٹھ سال سے زیادہ کا نہ تھا مگر بشرے سے آنے والی عظمت جھلک رہی تھی۔ روشن اور مردانہ چہرہ، پاک و صاف ہاتھ پاؤں پتلے پتلے سرخ ہونٹ تیز چلتی ہوئی نگاہیں۔ کالے کالے بھونرے کی طرح بال اور اس پر صاف ستھرے کپڑے، منشی جی نے پرتاپ سے کہا "یہاں آؤ پرتاپ" پرتاپ آہستہ آہستہ کچھ ہچکچاتا کچھ لجاتا قریب آیا۔ منشی جی نے پدرانہ محبت سے گود میں بٹھا لیا اور پوچھا "تم ابھی ابھی کونسی کتاب پڑھ رہے تھے؟"

پرتاپ بولنے ہی کو تھا کہ برجن بول اٹھی "ابا بڑی اچھی کہانیاں تھیں، کیوں بابا کیا پہلے چڑیاں بھی ہماری طرح باتیں کرتی تھیں؟"

منشی جی مسکرا کر بولے "ہاں وہ خوب بولتی تھیں"

ابھی ان کے منہ سے پوری بات بھی نہ نکلنے پائی تھی کہ پرتاپ جس کا شرمیلا پن اب دور ہو چلا تھا۔ بول اٹھا "نہیں برجن تمہیں بہلاتے ہیں یہ کہانیاں بنائی ہوئی ہیں"

منشی جی اس کی بے باکانہ تردید پر خوب ہنسے۔

اب تو پرتاپ بلبل کی طرح چہکنے لگا۔ اسکول اتنا بڑا ہے کہ شہر بھر کے لوگ اس میں بیٹھ جائیں۔ دیواریں اتنی اونچی ہیں جیسے تاڑ۔ بلدیو پرشاد نے جو گیند میں ہٹ لگائی

تو وہ آسمان میں چلا گیا۔ بڑے ماسٹر کی میز پر ہری ہری بانات بچھی ہوئی ہے۔ اس پر پھولوں سے بھرے گلاس رکھے رہتے ہیں۔ گنگا جی کا پانی سفید ہے، ایسے زور سے بہتا ہے کہ پہاڑ بھی ہو تو بہہ جائے۔ وہاں ایک سادھو بابا ہیں۔ ریل دوڑتی ہے سن سن اور اس کا انجن بولتا رہتا ہے بھک بھک، انجن میں بھاپ ہوتی ہے، اسی کے زور سے انجن چلتا ہے۔ گاڑی کے ساتھ ساتھ درخت بھی دوڑتے ہیں۔ اسی طرح کی باتیں پرتاپ نے اپنی بھولی بھالی زبان میں بیان کیں۔ برجن تصویر کی طرح خاموش بیٹھی ہوئی سن رہی تھی۔ ریل پر وہ بھی دو تین بار سوائی ہوئی تھی، مگر اسے آج تک یہ نہ معلوم ہوا کہ اسے کس نے بنایا اور یہ کیوں کر چلتی ہے۔ دو تین بار اس نے اپنے گرو جی سے یہ سوال کیا تھا مگر انہوں نے یہی کہہ کر ٹال دیا تھا۔ بچہ ایشور کی مہما اپرم پار ہے۔ برجن نے بھی یہی سمجھ رکھا تھا کہ ایشور کی مہما کوئی بڑا بھاری اور طاقتور گھوڑا ہے جو اتنی گاڑیوں کو سن سن کھینچے جاتا ہے۔ جب پرتاپ خاموش ہوا تو برجن نے باپ کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔ ''بابا ہم بھی پرتاپ کی کتاب پڑھیں گے''

منشی: ''بیٹی تم تو سنسکرت پڑھتی ہو، یہ تو بھاشا ہے''

برجن: ''تو میں بھی بھاشا ہی پڑھوں گی، اس میں کیسی اچھی کہانیاں ہیں۔ میری کتاب میں تو ایک کہانی بھی نہیں، کیوں بابا پڑھنا کسے کہتے ہیں؟''

منشی جی بغلیں جھانکنے لگے۔ انہوں نے آج تک خود بھی غور نہیں کیا تھا کہ پڑھنا کیا چیز ہے، ابھی وہ سر ہی کھجلا رہے تھے کہ پرتاپ بول اٹھا ''مجھے پڑھتے دیکھا؟ اسی کو پڑھنا کہتے ہیں''

برجن: ''کیا میں نہیں پڑھتی، میرے پڑھنے کو پڑھنا نہیں کہتے ہیں؟''

برجن سدھانت کومدی پڑھ رہی تھی۔ پرتاپ نے کہا ''تم طوطے کی طرح رٹتی ہو''

کچھ عرصہ سے سباما نے گنجائش نہ دیکھ کر مہراجن، کہار اور دو مہریوں کو جواب دے دیا تھا۔ کیونکہ اب نہ تو ان کی ضرورت تھی اور نہ ان کا خرچ سنبھالے سنبھلتا تھا۔ صرف ایک بڑھیا مہری باقی رہ گئی تھی۔ اوپر کا کام کاج وہ کرتی اور کھانا سباما اپنے ہاتھ سے پکا لیتی۔ مگر بے چاری ایسی سخت محنت کی عادی نہ تھی۔ چند ہی دنوں میں اسے تھکن کے سبب سے رات کو حرارت رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ جب دیکھیے حرارت موجود، جسم پھنکا جاتا ہے۔ نہ کھانے کی طرف رغبت ہے، نہ پینے کی طرف۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ مگر وہ ہے کہ روز معمول کے موافق کام کیے جاتی ہے۔ دوا دارو کی بھی کوئی ضرورت نہیں اور نہ کسی سے اس کا ذکر کرتی ہے۔ جب تک پرتاپ گھر پر موجود رہتا ہے تب تک وہ چہرے کو ذرا بھی مدغم نہیں ہونے دیتی تھی۔ مگر جوں ہی وہ مدرسہ چلا جاتا تھا لحاف اوڑھ کر پڑی رہتی ہے اور دن بھر پڑے پڑے کراہا کرتی تھی۔

پرتاپ سمجھ دار لڑکا تھا۔ ماں کی حالت روز بروز خراب دیکھ دیکھ کرتاڑ گیا کہ یہ بیمار ہے۔ ایک دن اسکول سے لوٹا تو سیدھا اپنے گھر گیا۔ بیٹے کو دیکھتے ہی سباما نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ مگر مارے ضعف کے چکر آ گیا اور ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ پرتاپ نے اسے سنبھالا اور اس کی طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا ''اماں تم آج کل بیمار ہو گیا؟ اتنی دبلی کیوں ہو گئی ہو؟ دیکھو تمہارا جسم کتنا گرم ہے کہ ہاتھ نہیں رکھا جاتا''

سباما نے ہنسنے کی کوشش کی۔ اپنی بیماری کا اظہار کر کے بیٹے کو کیسے تکلیف دے، ماں کا پاک اور بے غرض محبت کا انتہائی درجہ ہے۔ آواز کو ہلکا بنا کر بولی نہیں بیٹا بیمار تو نہیں ہوں آج ذرا حرارت ہو آئی تھی۔ شام تک بالکل اچھی ہو جاؤں گی۔ الماری میں حلوہ رکھا ہوا ہے نکال لو نہیں تم آ و بیٹھو میں ہی نکال دیتی ہو

پرتاپ: ''اماں تم مجھ سے بہانہ کرتی ہو، تم ضرور بیمار ہو، ایک دن میں کوئی اتنا دبلا

نہیں ہو جاتا''

سباما: (ہنس کر) ''کیا دیکھنے میں میں دبلی ہو گئی ہوں مجھے تو معلوم نہیں ہوتا''

پرتاپ: ''میں ڈاکٹر صاحب کے یہاں جاتا ہوں''

سباما: (پرتاپ کا ہاتھ پکڑ کر) ''تم کیا جانو وہ کہاں رہتے ہیں؟''

پرتاپ: ''پوچھتے پوچھتے چلا جاؤں گا''

سباما کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ اسے پھر چکر آیا اس کی آنکھیں پتھرا گئیں

پرتاپ اس کی یہ حالت دیکھ کر سہم گیا، اور کچھ تو نہ ہو سکا، دوڑا ہوا برجن کے دروازے پر آیا اور کھڑا ہو کر رونے لگا۔

ہر روز وہ اس وقت تک برجن کے گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔ آج جو دیر ہوئی تو وہ گھبرائی ہوئی ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ یکا یک جو دروازہ پر جھانکنے آئی تو پرتاپ کو دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے دیکھا۔ پہلے تو سمجھی کہ اس نے دل لگی سے منہ چھپا لیا ہے۔ مگر جب اس کے ہاتھ اٹھائے تو آنسو نظر آئے۔ چونک کر بولی ''کیوں روتے ہو؟ بتا دو''

پرتاپ نے کچھ جواب نہ دیا بلکہ اور سسکنے لگا

برجن: ''نہ بتاؤ گے، کیا چچی نے کچھ کہا ہے؟ کہ تم چپ نہیں ہوتے''

پرتاپ نے کہا ''نہیں برجن اماں بہت بیمار ہیں''

یہ سنتے ہی برج رانی دوڑی اور چشم زدن میں سباما کے سرہانے آ کھڑی ہوئی۔ دیکھا تو وہ بے حس و حرکت پڑی ہے۔ آنکھیں بند ہیں اور سانس زور زور سے چل رہی ہے، ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ ''چچی کیسا جی ہے، آنکھیں کھولو''

مگر چچی نے آنکھیں نہ کھولیں، تب اس نے طاق پر سے تیل اتارا اور سباما کے سر میں ڈال کر آہستہ آہستہ ملنے لگی۔ اس غریب کے سر میں مہینوں سے تیل پڑنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ٹھنڈی پہنچی تو آنکھیں کھل گئیں۔

برجن: ''چچی کیا جی ہے؟ کہیں درد تو نہیں؟''

سباما: ''نہیں بیٹی درد کہیں نہیں ہے، اب میں بالکل اچھی ہوں، بھیا کہاں ہے؟''

برجن: ''وہ تو میرے گھر ہیں بہت رو رہے تھے''

سباما: ''تم جاؤ اس کے ساتھ کھیلو، اب میں بالکل اچھی ہوں''

برجن: ''میں ابھی نہ جاؤں گی، جب تم اچھی ہو جاؤ گی تب جاؤں گی؟''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سوشیلا بھی داخل ہوئی۔ اسے سباما سے ملنے کا تو بہت دنوں سے اشتیاق تھا مگر موقع نہ ملتا تھا۔ اس وقت عیادت کے بہانے سے آ پہنچی۔ برجن نے اپنی ماں کو دیکھا تو اچھل پڑی اور تالی بجا بجا کر کہنے لگی ''اماں آئیں، اماں آئیں''

دونوں عورتوں میں شکوہ شکایت ہونے لگی۔ باتوں باتوں میں چراغ جل گیا۔ کسی کو خیال بھی نہ گزرا کہ پرتاپ کہاں ہے۔ کچھ دیر تو وہ دروازے پر کھڑا روتا رہا۔ پھر یکا یک آنکھیں پونچھ کر ڈاکٹر کے مکان کی طرف لپکا۔ ڈاکٹر منشی سالگرام کے دوستوں میں سے تھے۔ اور جب کبھی ضرورت ہوتی وہی بلائے جاتے۔ پرتاپ کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ برنا ندی کے کنارے لال بنگلے میں رہتے ہیں۔ اسے اب تک اپنے محلے سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ مگر اس وقت فرزندانہ جوش کی بے قراری میں اسے ان رکاوٹوں کا مطلق دھیان نہ آیا۔ گھر سے نکل کر بازار میں آیا اور ایک یکہ والے سے بولا لال بنگلے چلو گے؟ لال بنگلہ مشہور جگہ تھی۔ یکہ والا تیار ہو گیا اور آٹھ بجتے ہی ڈاکٹر صاحب کی فٹن سباما کے دروازے پر آ پہنچی۔ یہاں اس وقت چاروں طرف اس کی تلاش ہو رہی تھی۔ کہ دفعتاً وہ متانت کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا اندر آ گیا اور بولا پردہ کرو ڈاکٹر صاحب آتے ہیں۔

سباما اور سوشیلا دونوں چونک پڑیں۔ سمجھ گئیں کہ ڈاکٹر صاحب کو بلانے چلا گیا تھا۔ سباما نے فرط محبت سے اسے گود میں بٹھالیا، اور آنکھوں میں آنسو بھر کر پوچھنے لگی ''کیا اکیلے چلے گئے تھے۔ تمہیں راستہ کیسے معلوم ہوا۔ ڈر نہیں لگا؟ ہم سے بتلایا بھی نہیں

یونہی چلے گئے۔ تم کھو جاتے تو میں کیا کرتی۔ ایسا لعل کہاں پاتی؟'' یہ کہہ کر اس نے بیٹے کو بار بار چوما۔ پرتاپ ایسا خوش تھا گویا امتحان میں پاس ہو گیا۔ ذرا دیر میں پردہ ہوا اور ڈاکٹر صاحب آئے۔ سباما کی نبض دیکھی اسے تشفی دی۔ پرتاپ کو گود میں بٹھا کر باتیں کرتے رہے۔ دوا ساتھ لیتے آئے تھے۔ اسے پلانے کی تاکید کر کے نو بجے اپنے بنگلے کو واپس چلے گئے۔ مگر چونکہ بخار پرانا تھا، اس لیے پورے پورے مہینے بھر سباما کو کڑوی کڑوی دوائیں پینی پڑیں۔ ڈاکٹر صاحب دونوں وقت آتے اور ایسی توجہ سے اور شفقت سے پیش آتے گویا سباما ان کی بہن ہے۔

ایک دفعہ ڈرتے ڈرتے سباما نے فیس کے روپے ایک طشتری میں رکھ کر پیش کیے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے انہیں ہاتھ تک نہیں لگایا۔ صرف اتنا کہا ''اسے میری طرف سے پرتاپ کو دے دیجیے۔ وہ پاؤں پاؤں مدرسے جاتا ہے۔ پیر گاڑی مول لے لے گا''

برجن اور اس کی ماں دونوں آٹھوں پہر اس کی تیمارداری کے لیے حاضر رہتیں۔ ماں چاہے تساہل بھی کر جائے مگر برجن وہاں سے ایک دم کو بھی نہ ہٹتی۔ دو پلاتی، پانی دیتی جب سباما کی طبیعت ہلکی ہوتی تو اس سے بھولی بھالی باتیں کر کے اس کا دل بہلاتی۔ کھیلنا کودنا سب چھوٹ گیا۔ جب سباما بہت اصرار کرتی تو ذرا دیر کے لیے پرتاپ کے ساتھ باغیچے میں کھیلنے چلی جاتی۔ چراغ جلتے ہی پھر آ بیٹھتی اور جب تک مارے نیند کے آنکھیں جھک جھک نہ پڑتیں وہاں سے اٹھنے کا نام نہ لیتی۔ بلکہ اکثر وہیں سو جاتی۔ رات کو آدمی گود میں اٹھا کر گھر لے جاتے۔ نا معلوم اسے ایسی کیا دھن سوار تھی۔

ایک دن برج رانی سباما کے سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ نہ جانے کس خیال میں غرق تھی کہ آنکھیں دیوار کی طرف لگی ہوئی تھیں اور جس طرح درختوں پر چاندنی لہراتی ہے اسی طرح ہلکی ہلکی مسکراہٹ اس کے لبوں پر مسکرا رہی تھی اسے مطلق خبر نہ

ہوئی کہ چچی میری طرف تاک رہی ہیں۔ دفعتاً اس کے ہاتھ سے پنکھیا چھوٹ پڑی۔ جوں ہی وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکی کہ سباما نے اسے پیار سے گلے لگا لیا اور چمکار کر پوچھا ''برجن سچ بتلاؤ تم ابھی کیا سوچ رہی تھیں؟''

برجن نے سر جھکا لیا اور کچھ شرما کر بولی ''کچھ نہیں تمہیں نہ بتلاؤں گی''

سباما: (چمکار کر) ''میری اچھی برجن بتا دے کیا سوچتی تھی؟''

برجن: (لجاتے ہوئے) ''سوچتی تھی کہ جاؤ ہنسو مت نہ بتلاؤں گی''

سباما: ''اچھا نہ ہنسوں گی بتاؤ۔ لے یہی تو اب اچھا نہیں لگتا، پھر میں آنکھیں بند کر لوں گی''

برجن: ''کسی کو کہو گی تو نہیں؟''

سباما: ''نہیں کسی سے نہ کہوں گی''

برجن: ''سوچتی تھی کہ جب پرتاپ سے میرا بیاہ ہو جائے گا تو خوب مزے سے رہوں گی''

سباما نے اسے سینے سے چمٹا اور بولی ''پیاری وہ تو تیرا بھائی ہے''

برجن: ''ہاں بھائی ہے، میں جان گئی ہوں، تم مجھے بہو نہ بناؤ گی''

سباما: ''آج للو کو آنے دو، اس سے پوچھوں گی، دیکھوں کیا کہتا ہے''

برجن: ''نہیں نہیں ان کو نہ کہنا، میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں''

سباما: ''میں تو کہہ دوں گی''

برجن: ''تمہیں ہماری قسم ان سے نہ کہنا''

## 5

## شریفانہ زندگی کے نظارے

دن گزرتے گئے۔ دو سال گزر گئے۔ پنڈت موٹے رام روز علی الصبح آتے اور سدھانت کومدی پڑھاتے۔ حالانکہ اب ان کا آنا محض رسماً تھا، کیونکہ اس کتاب

کے پڑھنے میں برجن کا دل بالکل نہ لگتا تھا۔ایک روز انجینئر کے دفتر سے آئے۔ کمرے میں بیٹھے، نوکر جوتے کا فیتہ کھول رہے تھے کہ ردھیا مسکراتی ہوئی گھر سے نکلی۔اوران کے ہاتھ میں ایک سربمہر لفافہ رکھ دیا اور منہ پھیر کر ہنسنے لگی۔سرنامہ پر لکھا ہوا تھا۔''بخدمت جناب بابا صاحب برسد''

منشی: ''ارے تو کس کا خط لے آئی ہے، یہ میرا نہیں ہے''

مہری: ''سرکار کا ہی تو ہے۔کھولیں تو آپ''

منشی: ''کس نے دیا کوئی آدمی باہر سے آیا تھا''

مہری: ''آپ کھولیں گے تو پتہ لگ جائے گا''

منشی جی نے حیرت میں آ کر لفافہ کھولا، تو یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

''بابو کو برجن کا پرنام اور پالاگن پہنچے۔یہاں آپ کی کرپا سے کشل منگل ہے اور آپ کا کشل منگل شری وشوا ناتھ جی سے بدا منایا کرتی ہوں۔میں نے پرتاپ سے بھاشا سیکھ لی۔وہ اسکول سے آ کر شام کو مجھے پڑھاتے ہیں۔آپ ہمارے لیے اچھی اچھی کتابیں لائیے، کیونکہ پڑھنا ہی زندگی کا سکھ ہے اور ودیا انمول چیز ہے۔وید پران میں اس کا مہاتم لکھا ہوا ہے۔آدمی کو چاہیے کہ ودھیا دھن دل و جان سے جمع کرے۔ودیا سے سب دکھ دور ہو جاتے ہیں۔میں نے کل بیتال پچیسی کی کہانی سنائی، تو انہوں مجھے بہت خوبصورت گڑیا انعام دی ہے۔بہت اچھی ہے، میں اس کا بیاہ کروں گی، تب آپ سے روپیہ لوں گی، میں اب پنڈت جی سے نہ پڑھوں گی۔ کیونکہ اماں نہیں جانتی کہ میں بھاشا پڑھتی ہوں''

آپ کی پیاری

''برجن''

القاب دیکھتے ہی منشی جی کے کلیجے میں گدگدی محسوس ہونے لگی۔پھر تو ایک ہی نظر میں سارا خط پڑھ ڈالا، مارے خوشی کے ننگے پاؤں ہنستے ہوئے اندر دوڑ پڑے۔

پرتاپ کو گود میں اٹھالیا اور دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے سوشیلا کے پاس گئے اور خط دکھا کر کہا ''بوجھو خط کس کا ہے؟''

سوشیلا: ''لاؤ ہاتھ میں دو، دیکھوں''

منشی جی: ''نہیں وہیں سے بیٹھے بیٹھے بتاؤ جلدی''

سوشیلا: ''بوجھ جاؤں تو کیا دو گے؟''

منشی جی: ''پچاس روپے دودھ کے دھوئے ہوئے''

سوشیلا: ''پہلے روپیہ نکال کر رکھ دو، نہیں تو مکر جاؤ گے''

منشی جی: ''مکرنے والے کو کچھ کہتا ہوں، ابھی روپیہ لو، ایسا کوئی ٹٹ پونجیا سمجھ لیا ہے؟''

یہ کہہ کر دس روپیہ کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر دکھایا۔

سوشیلا'' کتنے کا نوٹ ہے؟''

منشی جی: ''پچاس روپیہ کا، ہاتھ میں لے کر دیکھو''

سوشیلا: ''لے لوں گی، کہے دیتی ہوں''

منشی جی: ''ہاں ہاں لے لینا، پہلے بتاؤ تو سہی''

سوشیلا: ''للو کا ہے، لایئے نوٹ، اب میں نہ مانوں گی''

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا

منشی جی: ''ایسی کیا رہزنی ہے، نوٹ چھینے لیتی ہو''

سوشیلا: ''زبان نہیں دی تھی کہ ابھی سے مکرنے لگے''

منشی جی: ''تم نے بوجھا بھی؟ صاف دھوکا کھا گئیں''

سوشیلا: ''بہانہ کرتے ہو چلو چلو، کیا نوٹ ہضم کرنے کی نیت ہے؟''

''کیوں للو یہ خط تمہارا ہی ہے نہ؟''

پرتاپ نے نیچی نگاہوں سے منشی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا ''میں نے

کہاں لکھا؟''

منشی جی: ''شرماؤ، شرماؤ''

سوشیلا: ''جھوٹ بولتا ہے، اسی کا خط ہے، تم لوگ آپس میں گھ کر آتے ہو''

پرتاپ: ''میرا خط نہیں ہے، سچ برجن نے لکھا ہے''

سوشیلا کے منہ سے بے اختیار نکلا ''برجن کا'' اور اس نے دوڑ کر شوہر کے ہاتھ سے خط چھینا اور بھونچک ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ مگر اب بھی یقین نہ آیا۔ برجن سے پوچھا ''کیوں بیٹی یہ تمہارا لکھا ہے'' برجن نے سر جھکا کر کہا ''ہاں'' یہ سنتے ہی ماں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اب آج سے برجن کا یہ حال ہو گیا کہ جب دیکھیے برجن قلمدان لیے بیٹھی ہے اور کاغذ سیاہ کر رہی ہے۔ گھر کے کام دھندے سے اسے پہلے ہی کچھ سروکار نہ تھا۔ لکھنا آنا سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ ماں اس کی مصروفیات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی۔ باپ پھولا نہ سماتا تھا۔ نت نئی کتابیں لاتا کہ برجن پڑھ کر ہوشیار ہو جائے گی تو پڑھے گی۔ اگر وہ کبھی اپنا پیر آپ دھو لیتی یا کھانا کھا کر آپ ہی ہاتھ دھونے لگتی تو ماں مہریوں پر برس پڑتی ''آنکھیں پھوٹ گئیں ہیں، چربی چھا گئی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے پانی انڈیل رہی ہے اور تم کھڑی تاکتی ہو''

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ برجن کا بارہواں سال پورا ہو گیا۔ مگر ابھی تک اسے چاول ابالنے کا شعور نہیں تھا۔ چولہے کے سامنے بیٹھنے کا کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا۔ سباما نے ایک دن اس کی ماں سے کہا

''بہن برجن سیانی ہوئی، کیا کچھ ڈھنگ نہ سکھاؤ گی؟''

سوشیلا: ''جی تو چاہتا ہے کہ لگا لگاؤں مگر کچھ سوچ کر رہ جاتی ہوں''

سباما: ''کیا سوچ کر رہ جاتی ہو؟''

سوشیلا: ''کچھ نہیں آلکس آ جاتا ہے''

سباما: ''تو یہ کام میرے سپرد کرو، کھانا پکانا عورتوں کے لیے سب سے ضروری بات

ہے''

سوشیلا: ''ابھی چولہے کے آگے اس سے بیٹھا نہ جائے گا''

سباما: ''کام کرنے ہی سے آتا ہے''

سوشیلا: ''(جھینپتے ہوئے) پھول سے گال کملا کر رہ جائیں گے''

دوسرے دن سے برجن کھانا پکانے لگی۔ پہلے دن پانچ دن اسے چولہے کے سامنے بیٹھنے میں سخت تکلیف ہوئی۔ آگ نہ جلتی۔ پھونکنے لگتی تو آنکھوں سے پانی بہتا، اور بوٹی کی طرح لال ہو جاتیں۔ چنگاریوں سے کئی ریشمی ساڑھیاں تیاناس ہوگئیں۔ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ سب مصیبتیں رفع ہوگئیں۔ سباما ایسی نیک مزاج عورت تھی کہ کبھی ناراض نہ ہوتی۔ ہمیشہ چمکار کر اسے کام میں لگائے رکھتی۔

ابھی برجن کو کھانا پکارتے دو ماہ سے زیادہ نہ گزرے ہوں گے کہ ایک دن اس نے پرتاپ سے کہا۔ ''للو مجھے کھانا پکانا آ گیا ہے''

پرتاپ: ''سچ''

برجن: ''کل چچی نے میرا کھانا کھایا تھا۔ بہت خوش ہوئیں''

پرتاپ: ''تو بھئی ایک میری بھی دعوت کردو''

برجن: (خوش ہوکر) ''اچھا کل''

دوسرے دن نو بجے برجن نے پرتاپ کو کھانے کے لیے بلایا۔ اس نے جا کر دیکھا تو چوکا لگا ہوا ہے۔ تازی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی ہے، آسن صفائی سے بچھا ہوا ہے۔ ایک تھالی میں چاول اور چپاتیاں ہیں۔ دال اور ترکاریاں الگ الگ کٹوروں میں رکھی ہوئی ہیں اور لوٹا اور گلاس پانی سے بھرا ہوا موجود ہے۔ یہ صفائی اور سلیقہ دیکھ کر پرتاپ سیدھا دوڑتا ہوا منشی سنجیون لال کے پاس گیا۔ اور انہیں لا کر چوکے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ چٹ کپڑے اتار کر منشی جی فرط حیرت کے ساتھ ہاتھ

پیر دھو کر پرتاپ کے ساتھ جا بیٹھے۔ بے چاری برجن کو کیا معلوم تھا کہ حضرت بھی بن بلائے مہمان ہو جائیں گے۔ اس نے صرف پرتاپ کے لیے کھانا بنایا تھا۔ اس وقت بہت شرمائی اور نیچی نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ سوشیلا تاڑ گئی، مسکرا کر منشی جی سے بولی ''تمہارے لیے کھانا تیار ہے۔ لڑکے کے بیچ میں کیا آ کے کود پڑے''

برج رانی نے شرماتے ہوئے دو تھالیوں میں تھوڑا تھوڑا کھانا پروسا

منشی جی: ''برجن نے چپاتیاں خوب بنائی ہیں۔ نرم، سفید اور میٹھی''

پرتاپ: ''چاول دیکھیے بکھیر دو اور چن لو''

منشی جی: ''میں نے ایسی چپاتیاں کبھی نہیں کھائیں، سالن بہت لذیذ ہے''

پرتاپ: ''برجن چچا کو شوربے دار آلو دو''

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا، برجن نے لجا کر سر نیچا کر لیا، بٹلی خشک ہو رہی تھی

سوشیلا: (شوہر سے) ''اب اٹھو گے بھی؟ ساری رسوئی چٹ کر گئے اور ابھی اڑے بیٹھے ہو''

منشی جی: ''کیا تمہاری رال ٹپک رہی ہے؟''

آخر دونوں آدمی رسوئی کا صفایا کر کے اٹھے۔ منشی جی نے اسی وقت ایک اشرفی نکال کر برجن کو انعام دی۔

## 6

## ڈپٹی شیاما چرن

ڈپٹی شیاما چرن کا رعب سارے شہر پر طاری تھا۔ شہر میں کوئی ایسا حاکم نہ تھا جس کی لوگ اتنی عزت کرتے ہوں۔ اس کا باعث کچھ تو یہ تھا کہ وہ مزاج کے بہت خلیق اور حلیم تھے اور کچھ یہ کہ رشوت سے انہیں قطعی احتراز تھا۔ منصفانہ نگاہ ایسے باریک تھی کہ دس بارہ سال کے عرصے میں مشکل سے ان کے دو چار فیصلوں کی اپیل ہوئی ہو

گی۔ انگریزی کا ایک حرف نہ جانتے تھے۔ مگر اچھے اچھے بیرسٹروں اور وکیلوں کو بھی ان کی قانونی دستگاہ اور نکتہ رسی پر حیرت ہوتی تھی۔ مزاج میں آزادپسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مکان اور کچہری کے سوا کسی نے انہیں اور کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ منشی سالگرام جب تک زندہ رہے یا یوں کہو کہ موجود تھے تو کبھی کبھی ان کے یہاں تفریحاً چلے جاتے تھے۔ جب سے وہ لاپتہ ہوئے ڈپٹی صاحب نے گھر چھوڑ کر ملنے کی قسم کھالی۔ کئی برس ہوئے ایک بار کلکٹر صاحب کے سلام کو حاضر ہوئے۔ خانساماں نے کہا صاحب غسل کر رہے ہیں۔ دو گھنٹے تک برآمدے میں ایک مونڈھے پر بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد صاحب بہادر ہاتھ میں ایک ٹینس بیٹ لیے نکلے اور معذرت کے طور پر کہا ''بابو صاحب ہم کو بہت افسوس ہے، کہ آپ کو راہ دیکھنا پڑا۔ ہمیں آج فرصت نہیں ہے۔ کلب گھر جانا ہے، آپ پھر کبھی آویں'' یہ سن کر انہوں نے صاحب بہادر کو فرشی سلام کیا اور اتنی سی بات پر پھر کسی انگریز کی ملاقات کو نہ گئے۔

بابو شیاما چرن اگرچہ کسی معنی میں حریص شہرت نہ تھے۔ مگر اپنے نام نیک کو بدنامی کی ہوا سے بچاتے رہتے تھے۔ خاندانی اعزاز اور وجاہت پر بھی انہیں کسی قدر ناز تھا۔ اپنی وضع کے وہ بڑے رنگین مزاج آدمی تھے۔ ان کی باتیں ظرافت سے بھری ہوتی تھیں۔ شام کے وقت جب وہ چند منتخب احباب کے ساتھ صحن میں بیٹھتے تو ان کے قہقہہ کی آواز باغیچے سے سنائی دیتی تھی۔ نوکروں چاکروں سے بہت بے تکلفی کا برتاؤ رکھتے۔ یہاں تک کہ ان کے ساتھ الاؤ کے گرد بیٹھنے سے عار نہ تھا۔ مگر ان کا رعب کچھ ایسا چھایا ہوا تھا کہ کسی کو ان کی کمزوریوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ وضع قطع سادہ رکھتے۔ کوٹ پتلون سے انہیں نفرت تھی۔ بٹن دار اونچی اچکن اس پر ایک ریشمی کام کی عبا، سیاہ شملہ، ڈھیلا پاجامہ اور دلی کی ساخت کا نوکدار جوتا ان کی خاص وضع تھی۔ ان کے دوہرے بدن سرخ و سفید چہرہ اور درمیانہ قد پر

جس قدر یہ لباس زیب دیتا تھا، اتنا کوٹ پتلون سے ممکن نہ تھا۔

مگر ڈپٹی شیاماں چرن کا رعب چاہے سارے شہر میں چھایا ہوا ہو خود اپنے گھر کی چہار دیواری میں ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ یہاں مسز شیاما چرن کی عملداری تھی۔ اور وہ اپنے ممالک محروسہ میں مطلق العنانی کے ساتھ راج کرتی تھیں۔ نوکروں کا تقرر، ان کی برخاستگی، ان کی سزا، خانگی ضروریات، لین دین، غرض ان کل امور میں انہیں سیاہ و سفید کا اختیار تھا۔ کئی برس گزرے ڈپٹی صاحب نے پریم وتی کی مرضی کے خلاف ایک مہراجن نوکر رکھ لی۔ مہراجن ذرا رنگیلی تھی۔ پریم وتی اپنے شوہر کی اس مداخلت بے جا پر ایسی برہم ہوئی کہ ہفتوں تک کوپ بھون میں بیٹھی رہی۔ آخر زچ ہو کر ڈپٹی صاحب نے مہراجن کو رخصت کر دیا۔ تب سے انہیں پھر خانگی معاملات میں رخنہ ڈالنے کی جرأت نہ ہوئی۔ حالانکہ بے چارے بہت متقی اور پاک نفس آدمی تھے۔ اور اب سن بھی چالیس سے متجاوز ہو گیا تھا مگر پریم وتی کے دل میں ابھی تک ان کی جانب سے بدگمانی تھی۔ اس کا مزاج خلقتاً تحکمانہ واقع ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے جھوٹی شیخی اور بڑے بول سے سخت نفرت تھی۔ جب کبھی وہ شہر میں کسی کے یہاں تقریبوں میں شریک ہونے کے لیے جاتی تو گویا یہ مسلمہ بات تھی کہ وہاں بدمزگی ضرور پیدا ہو گی۔ عورتوں کو بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے وقت دیکھ کر اس سے ضبط نہ ہوتا اور برس پڑتی۔ امر حق کے اظہار سے وہ کبھی نہ چوکتی۔ چاہے اس کی پاداش میں اسے تو تو میں میں بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔ طعنوں کے تیر چھونے میں تو اسے خاص ملکہ تھا۔

منشی جی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑا لڑکا رادھا چرن رڑکی کالج میں پچھلے سال ڈگری حاصل کر چکا تھا۔ اس کی شادی فتح پور سیکری کے ایک متمول گھرانے میں ہو گئی تھی۔ چھوٹا لڑکا کملا چرن ابھی تک بن بیاہا تھا۔ پریم وتی نے بچپن ہی سے لاڈ پیار کر کے اسے ایسا بے باک اور بدذوق بنا دیا تھا کہ اس کی طبیعت پڑھنے لکھنے کی

طرف ذرا بھی مائل نہ ہوتی۔ پندرہ برس کا ہو چکا تھا مگر ابھی تک سیدھا سا خط لکھنے کی بھی تمیز نہ تھی۔ میاں جی کئی بیٹھے مگر اس نے مہینہ بھر کے اندر نکال کر دم لیا۔ مدرسے میں نام بھی لکھایا گیا۔ مگر وہاں جاتے ہی اسے بخار چڑھ جاتا۔ دردسر شروع ہو جاتا۔ اس لیے وہاں سے بھی اٹھا لیا تب ایک ماسٹر صاحب اتالیقی پر مامور ہوئے۔ مگر ان کی تین مہینے کی دوران ملازمت میں کملا چرن نے مشکل سے تین سبق پڑھے ہوں گے۔ آخر ماسٹر صاحب بھی رخصت ہوئے۔ تب ڈپٹی صاحب نے خود پڑھانے کی ٹھانی مگر ایک ہی ہفتہ میں انہیں کئی بار کملا چرن کا سر ہلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گواہوں کے بیانات اور وکلا کی جرحوں کی تہہ تک پہنچنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا کسی بدشوق لڑکے کے دل میں تعلیم کی رغبت پیدا کرنا۔ پریم وتی نے اس مار دوھاڑ پر ایسی داد فریاد مچائی کہ آخر ڈپٹی صاحب نے بھی جھلا کر چھوڑ دیا۔ کملا کچھ ایسا قبول صورت، ایسا نازک بدن اور شیریں زبان تھا کہ ماں اسے سب لڑکوں سے زیادہ چاہتی۔ اس کی نازبرداریوں نے کملا کو کنکوے بازی، کبوتر بازی اور اسی قبیل کے دوسرے مشاغل کا دلدادہ بنا دیا۔ صبح ہوئی اور کبوتر اڑائے جانے لگے۔ بٹیروں کے جوڑ چھوٹنے لگے شام ہوئی اور کنکوے کے لمبے لمبے پیچ ہونے لگے۔ کچھ دنوں سے جوئے کا چسکا بھی پڑ چلا تھا۔ آئینہ، کنگھی اور عطر تیل میں تو گویا اس کی جان بستی تھی۔ سن ابھی کچھ نہ تھا مگر شہدوں کے فیض صحبت سے نظر بازی میں شہرہ آفاق تھے۔

پریم وتی ایک دن سہاما سے ملنے گئی۔ وہاں اس نے برج رانی کو دیکھا اور اسی دن سے اس کا دل للچایا ہوا تھا کہ اگر یہ بہو بن کر میرے گھر میں آئے تو گھر کے بھاگ جاگ اٹھیں۔ ایک رازداں عورت کے ذریعہ سے سوشیلا پر اپنا عندیہ ظاہر کیا۔ برجن کو تیرہواں سال شروع ہو چکا تھا۔ اور میاں بیوی میں شادی کے متعلق صلاح و مشورہ ہو رہا تھا۔ پریم وتی کا عندیہ پا کر دونوں پھولے نہ سمائے۔ ایک تو جان پہچان

کا آدمی پھر عالی خاندان، لڑکا ذہین اور تعلیم یافتہ اور موروثی جائیداد کثیر، اگر ان سے ناتا ہو جائے تو کیا پوچھنا، چٹ پٹ باقاعدہ طور پر پیغام کہلا بھیجا۔ اس طرح اتفاقات نے اس زہریلے درخت کا بیج بو دیا جس نے تین ہی برس میں خاندان تباہ کر دیا۔ مستقبل ہماری نگاہوں سے کیسا پوشیدہ رہتا ہے۔ جوں ہی پیغام پریم وتی پھولی نہ سمائی۔ ساس نند اور بہو میں باتیں ہونے لگیں۔

بہو: (چندرا) ''کیوں اماں کیا آپ اسی سال بیاہ کریں گی؟''

پریم وتی: ''اور کیا تمہارے لالہ جی کے ماننے کی دیر ہے''

بہو: ''کچھ تلک جہیز بھی بنایا''

پریم وتی: ''تلک جہیز ایسی لڑکیوں کے لیے نہیں بنایا جاتا۔ جب ترازو میں پاسنگ اور لڑکی لڑکے کے برابر نہ ٹھہرے تب جہیز کا پاسنگ بنا کر اسے برابر کر دیتے ہیں۔ ہماری برج رانی کملا سے بہت بھاری ہے''

سیوتی: ''کچھ دنوں گھر میں خوب چہل پہل رہے گی۔ بھابی گیت گائیں گی۔ میں ڈھولک بجاؤں گی، کیوں بھابی؟''

چندرا: ''مجھے ناچنا گانا نہیں آتا''

چندرا کی آواز بھاری تھی۔ جب گاتی تو راگ میں بےسراپن آ جاتا۔ اس لیے اسے گانے سے چڑ تھی۔

سیووتی: ''تم آپ ہی کہو، تمہارے گانے کی سنسار میں دھوم ہے؟''

چندرا جل گئی۔ تیکھی ہو کر بولی ''جسے ناچ گا کر دوسروں کو لبھانا ہو وہ ناچنا گانا سیکھے''

سیوتی: ''تم ذرا سی دل لگی میں ناراض ہو جاتی ہو، ذرا وہی گیت گاؤ'' تم تو شیام بڑے بےکھبر ہو اس وقت سننے کو بہت جی چاہتا ہے۔ مہینوں سے تمہارا گانا نہیں سنا

چندرا: ''تمہی گاؤ، تمہارا گلا کوئلوں کا سا ہے''

سیوتی: ''لے اب تمہاری یہی شرارت اچھی نہیں لگتی، میری بھابی ذرا گاؤ''

چندرا: ''میں اس وقت ہرگز نہ گاؤں گی، کیا مجھے ڈومنی مقرر کیا ہے؟''

سیوتی: ''میں تو بنا گیت سنے آج تمہارا پیچھا نہ چھوڑوں گی''

سیوتی کی آواز نہایت دلکش اور سریلی تھی۔ خدو خال بھی دلفریب، چمپئی رنگ، رسیلی آنکھیں پیازی رنگ کی ساڑھی اس پر خوب کھل رہی تھی۔ آپ ہی آپ گانے لگی۔

تم تو شیام بڑے بے کھبر ہو      تم تو شیام

آپ تو شیام پیو دودھ کے کلہڑ      میری تو پانی پر گجر، پانی پر گجر ہو

تم تو شیام

''دودھ کے کلہڑ'' پر بے اختیار ہنسی پڑی۔ پریم وتی بھی مسکرائی، مگر چندرا روہانسی ہوگئی۔ بولی ''بنا ہنسی کی ہنسی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی، اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

سیوتی: ''آؤ ہم تم مل کر گائیں''

چندرا: ''کوئل اور چیل کا کیا ساتھ''

سیوتی: ''غصہ تو تمہاری ناک پر رہتا ہے''

چندرا: ''تو ہمیں کیوں چھیڑتی ہو؟ ہمیں گانا نہیں آتا مگر کوئی تم سے شکایت کرنے تو نہیں جاتا''

''کوئی'' کا اشارہ رادھاچرن کی طرف تھا۔ چندرا میں چاہے اور کوئی گن نہ ہو مگر شوہر کی خدمت دل و جان سے کرتی تھی، ان کا سر ذرا دھمکا اور اس کی جان نکلی۔ ان کو گھر آنے میں ذرا دیر ہوئی اور یہ بے قرار ہونے لگی۔ جب سے وہ رڑکی چلے گئے تھے تب سے چندرا کا ہنسنا بولنا چھوٹ گیا۔ ان کی خوشی اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔ انہی باتوں نے رادھاچرن کو بیوی کا شیدا بنا دیا تھا۔ حسن سلیقہ اور یہ گن محبت کے مقابلہ میں بہت ارزاں چیزیں ہیں۔ محبت حسن سلیقہ اور گن کی سب خامیاں پوری کر

دیتی ہے۔

سیوتی: ”شکایت کیوں کرے گا، کوئی تو تم پر دل و جان سے ریجھا ہوا ہے“

چندرا: ”ادھر کئی دن سے خط نہیں آیا“

سیوتی: ”تین چار دن ہوئے ہوں گے“

چندرا: ”تم سے ہاتھ جوڑ کے ہار گئی ہم لکھتی ہی نہیں“

سیوتی: ”اب وہی باتیں روز روز کون لکھے۔ کوئی نئی بات ہو تو لکھنے کا جی چاہے“

چندرا: ”آج شادی کا حال لکھ دینا، لاؤں قلم دوات“

سیوتی: ”مگر ایک شرط پر لکھوں گی“

چندرا: ”بتاؤ“

سیوتی: ”تمہیں شام والا گیت گانا پڑے گا“

چندرا: ”اچھا گاؤں گی، ہنسنے ہی کو جی چاہتا ہے نا؟ ہنس لینا“

سیوتی: ”پہلے گانا تو لکھوں“

چندرا: ”نہ لکھو گی، پھر باتیں بنانے لگو گی“

سیوتی: ”تمہاری قسم لکھ دوں گی، گاؤ“

چندرا گانے لگی

تم تو شیام پیو دودھ کے کلہڑ    میری تو پانی پہ گجر، پانی پہ گجر ہو

تم تو شیام بڑے بے کھبر ہو

آخری الفاظ کچھ اس بے سرے پن سے نکلتے تھے کہ ہنسی کا ضبط کرنا محال تھا۔ سیوتی نے روکا مگر ہنسی نہ رک سکی۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

چندرا نے دوسرا بند گایا۔

آپ تو شیام رکھو دو دولغیاں (لگائیاں) میری تو آپی پہ نجر آپی پہ نجر ہو

تم تو شیام

لغیاں پر سیوتی ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔ چندرا نے آب دیدہ ہو کر کہا، اب تو خوب ہنس چکیں، ''لاؤں قلم دوات؟''

سیوتی: ''نہیں نہیں، ابھی ذرا ہنس لینے دو''

سیوتی ہنس رہی تھی کہ بابو کملا چرن باہر سے تشریف لائے۔

پندرہ سولہ برس کا سن تھا۔ گورا گورا رنگ، چھریرا بدن، خوش رو، چہرہ زرد، پرتکلف پوشاک زیب تن کیے۔ عطر میں بسے ہوئے، آنکھوں میں سرمہ، لبوں پر مسکراہٹ اور ہاتھ میں بلبل، آ کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔

سیوتی بولی: ''کملو منہ میٹھا کراؤ تو تمہیں خوشخبری سنائیں، سنتے ہی پھڑک اٹھو گے''

کملا: ''منہ تو تمہارا آج ضرور میٹھا ہو گا چاہے خوشخبری سناؤ نہ سناؤ۔ آج اس شیر نے وہ میدان مارا ہے کہ باید و شاید''

یہ کہہ کر کملا چرن نے بلبل کو انگوٹھے پر بٹھا لیا

سیوتی: ''میری خبر سنتے ہی ناچنے لگو گے''

کملا ''تو بہتر ہے آپ نہ سنائیے۔ میں تو آج یوں ہی ناچ رہا ہوں، اس شیر نے آج ناک رکھ لی۔ سارا شہر دنگ رہ گیا۔ نواب منے خاں بہت دنوں سے ایں جناب کی آنکھوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ ایک مہینہ ہوتا ہے میں ادھر سے نکلا تو آپ فرمانے لگے۔ میاں کوئی پٹھا تیار ہو تو لاؤ۔ دو چونچیں ہو جائیں۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنا پرانا بلبل دکھایا۔ میں نے عرض کیا بندہ نواز، ابھی تو نہیں مگر ایک مہینے میں انشاء اللہ آپ سے ضرور ایک جوڑ ہو گی اور بد بد کر، آج آغا شیر علی کے اکھاڑے میں بدان کی ٹھہری، پچاس پچاس روپیہ کی بازی تھی۔ لاکھوں آدمی جمع تھے۔ نواب کا بلبل جہاں دیدہ، یقین مانو سیوتی کمبخت کبوتر کے برابر تھا۔ مگر جس وقت یہ پٹھا چلا ہے تو اس کی اٹھی ہوئی گردن، مستانہ چال اور گٹھیلے پن پر لوگ واہ واہ کرنے لگے۔ جاتے

جاتے ہی اس نے اس کا ٹیٹوا لیا مگر وہ بھی محض بھولا نہ تھا۔ سارے شہر کے بلبلیوں کو سر کیے ہوئے تھا۔ زور سے لات چلائی۔ اس نے خالی دی اور پھر جھپٹ کر اس کی چوٹی دبائی۔ اس نے پھر چوٹ کی، یہ نیچے آیا اور چو طرفہ غل مچ گیا۔ مارا مارا دیا۔ تب تو ایں جناب کو بھی غصہ آیا۔ ڈپٹ کر جو للکارتا ہوں تو یہ اوپر اور وہ نیچے دبا ہوا۔ پھر تو اس نے ہزار ہزار بار سر پٹکا کہ اوپر آ جائے مگر اس شیر نے ایسا دابا کہ سر نہ اٹھانے دیا۔ نواب صاحب خود موجود تھے۔ بہت چیخے چلائے مگر کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے ایسا دبوچا تھا جیسے باز چڑی کو، آخر کمبخت بگٹٹ بھاگا، اس نے پالی کے اس سرے تک پیچھا کیا مگر نہ پا سکا۔ لوگ حیرت سے دنگ رہ گئے۔ نواب صاحب کا تو چہرہ فق ہو گیا۔ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ روپیہ ہارنے کی تو انہیں کچھ پرواہ نہیں تھی۔ لاکھوں کی آمدنی ہے۔ مگر شہر میں جوان کی دھاک جمی ہوئی تھی وہ جاتی رہی۔ روتے ہوئے گھر کو سدھارے۔ سنتا ہوں یہاں سے جاتے ہی اپنے بلبل کو زندہ دفن کر دیا۔"

یہ کہہ کر کملا چرن نے جیب کھنکھنائی

سیوتی: "تو پھر کھڑے کیا کر رہے ہو، آگرہ والی دوکان پر آدمی بھیجو"

کملا: "تمہارے لیے کیا لاؤں بھابی؟"

سیوتی: "دودھ کے کلھڑ"

کملا: "اور بھیا کے لیے؟"

سیوتی: "دو دو لغیاں"

یہ کہہ کر دونوں قہقہے لگانے لگے

## 7

## سرد مہری محبت کو بھلا نہیں سکتی!

سبا مادل و جان سے شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ صبح سے شام تک شادی ہی کے دھندوں میں الجھی رہتی۔ سوشیلا لونڈیوں کی طرح اس کے حکم کی تعمیل

کیا کرتی۔ منشی سنجیون لال صبح سے شام تک خاک چھانتے رہتے۔ اور برجن جس کے لیے یہ سب تیاریاں ہو رہی تھیں اپنے کمرے میں دن رات بیٹھی رویا کرتی تھی۔ کسی کو اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ دم بھر کو اس کا جی بہلائے۔ یہاں تک پرتاپ بھی اس کی صورت سے بیزار نظر آتا تھا۔ وہ بہت اداس رہتا تھا۔ سویرے کا نکلا ہوا شام کو گھر آتا اور اپنی منڈیر پر چپ چاپ جا بیٹھتا۔ برجن کے گھر نہ جانے کی تو اس نے قسم ہی کھالی تھی۔ بلکہ جب کبھی وہ آتے ہوئے دکھائی دیتی تو چپکے سے سرک جاتا۔ یا اگر کہنے سننے سے بیٹھتی بھی تو کچھ اس طرح منہ پھیر لیتا اور ایسی خشکی سے پیش آتا کہ برجن رونے لگتی۔ اور سباما سے جا کر کہتی۔ ''چچی للو مجھ سے ناراض ہیں۔ میں بلاتی ہوں تو بھی نہیں بولتے تم چل کر منا دو۔ یہ کہہ کر وہ مچل جاتی اور سباما کا آنچل پکڑ کر کھینچتی ہوئی پرتاپ کے گھر لاتی۔ جیسے کوئی فریادی اپنے حمایتی کو ساتھ لائے۔ مگر پرتاپ دونوں کو دیکھتے ہی بھاگ نکلتا اور برج رانی دروازے تک اس کے پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی آتی کہ للو ذرا سن لو۔ تمہیں ہماری قسم ذرا سن لو۔ مگر جب وہ نہ سنتا اور نہ ہی منہ پھیر کر دیکھتا تو بے چاری لڑکی زمین پر بیٹھ جاتی اور خوب پھوٹ پھوٹ کر روتی اور کہتی یہ مجھ سے کیوں روٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے تو انہیں کبھی کچھ نہیں کہا۔ سباما اسے سینے سے لگا لیتی اور سمجھاتی بیٹھی جانے دو للو پاگل ہو گیا ہے۔ اسے بیٹے کی سرد مہری کا راز معلوم ہو گیا تھا''

آخر شادی کو صرف پانچ دن رہ گئے۔ عزیز و اقارب دور و نزدیک سے آنے لگے۔ برجن کو باہر نکلنے کی ممانعت ہو گئی۔ کنگن بدھا گیا۔ آنگن میں خوبصورت منڈوا چھا گیا۔ یہ کچے دھاگے کا کنگن پاک فرائض کی ہتھکڑی ہے جو کبھی ہاتھ سے نہ نکلے گی۔ اور اس محبت اور شفقت کے سائے کی یادگار ہے۔ مرتے دم تک سر سے نہ اٹھے گا۔ آج شام کو سباما سوشیلا مہراجنیں سب کی سب مل کر دیوی جی کی پوجا کرنے لگیں۔ مہریاں اپنے دھندوں میں لگی ہوئی تھیں۔ برجن گھبرا کر اپنے کمرے سے نکلی

اور پرتاپ کے گھر آ پہنچی۔ چوطرفہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف پرتاپ کے کمرے میں دھندلی سی روشنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ برجن کمرے میں داخل ہوئی تو کیا دیکھتی ہے۔ میز پر لیمپ روشن ہے اور پرتاپ ایک کھری چارپائی پر پڑا سو رہا ہے۔ دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ بہت پژمردہ اور مغموم نظر آتا تھا۔ سب چیزیں ادھر ادھر بے قرینہ پڑی ہوئی تھیں۔ فرش پر منوں گرد جمع تھی۔ کتابیں بکھری ہوئی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کمرہ کو کسی نے مہینوں سے نہیں کھولا۔ یہ وہی پرتاپ تھا جو صفائی پر جان دیتا تھا۔ برجن نے چاہا اسے جگا دوں۔ مگر پھر کچھ سوچ کر وہ زمین سے کتابیں اٹھا اٹھا کر الماریوں میں رکھنے لگی۔ میز پر سے گرد جھاڑی۔ تصویروں کے منہ سے گرد کی نقاب اٹھائی کہ دفعتاً پرتاپ نے کروٹ بدلی۔ اور اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ ''برجن میں تمہیں نہیں بھول سکتا'' پھر ذرا دیر کے بعد ''برجن !! کہاں جاتی ہو۔ یہیں بیٹھو'' پھر کروٹ بدل کر۔ نہ بیٹھو گی۔ اچھا جاؤ میں تم سے نہ بولوں گا پھر ذرا ٹھہر کر ''اچھا جاؤ دیکھیں کہاں جاتی ہو؟'' یہ کہہ کر وہ لپکا جیسے کسی بھاگتے ہوئے آدمی کو پکڑ رہا ہو۔ برجن کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایک منٹ تک اس کی بے معنی نگاہیں برجن کے چہرے پر گڑی رہیں۔ پھر چونک کر اٹھ بیٹھا اور برجن کا ہاتھ چھوڑ کر بولا ''تم کب آئیں برجن؟ میں ابھی ابھی تمہارا خواب دیکھ رہا تھا''

برجن نے بولنا چاہا مگر گلا رندھ گیا اور آنکھیں بھر آئیں۔ پرتاپ نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر پھر کہا ''کیا یہ سب تم نے صاف کیا؟ تمہیں بڑی تکلیف ہوئی ہوگی''

برجن نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا

پرتاپ: ''برجن تم مجھے بھول کیوں نہیں جاتیں؟''

برجن نے پرنم آنکھوں سے دیکھ کر کہا ''کیا تم مجھے بھول گئے ہو؟''

پرتاپ نے نادم ہو کر سر جھکا لیا۔

تھوڑی دیر تک دونوں خیالات سے بھرے زمین کی طرف تکتے رہے۔ پھر برجن نے پوچھا ''تم مجھ سے ناراض کیوں ہو؟ میں نے کوئی خطا کی ہے؟''

پرتاپ: ''نہ جانے کیوں اب تمہیں دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہیں چلا جاؤں''

برجن: ''کیا تم کو میری بھی محبت نہیں معلوم ہوئی؟ میں دن بھر رویا کرتی ہوں، تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا تم مجھ سے بولتے تک نہیں، بتلاؤ میں نے تمہیں کیا کہا کہ تم اتنا روٹھ گئے''

پرتاپ: ''میں تم سے روٹھا تھوڑے ہی ہوں''

برجن: ''تو مجھ سے بولتے کیوں نہیں؟''

پرتاپ: ''میں چاہتا ہوں کہ تمہیں بھول جاؤں تم امیر ہو۔ تمہارے ماں باپ ہیں میں یتیم ہوں، میرا تمہارا کیا ساتھ؟''

برجن: ''اب تک تو تم نے یہ حیلہ نکالا نہیں تھا۔ کیا اب میں زیادہ امیر ہو گئی ہوں؟''

یہ کہہ کر برجن رونے لگی۔ پرتاپ بھی پسیجا اور بولا ''برجن ہمارا تمہارا بہت دنوں تک ساتھ رہا۔ اب بچھڑنے کے دن آ گئے۔ چند دنوں میں تم یہاں والوں کو چھوڑ کر سسرال چلی جاؤ گی اس وقت مجھے ضرور بھول جاؤ گی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں بھول جاؤں۔ مگر کتنا ہی چاہتا ہوں کہ تمہاری باتیں بھول جاؤں مگر وہ نہیں مانتیں ابھی سوتے میں تمہارا ہی سپنا دیکھ رہا تھا''

ڈپٹی شیاما چرن کا مکان آج حسینوں کے جمگھٹ سے اندر کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ سیوتی کی چار سہیلیاں رکمنی، سیتا، رام دئی، چندر کنور بھی سولہوں سنگھار کیے اٹھلاتی پھر رہی تھیں۔ ڈپٹی صاحب کی بہن جانکی کنور بھی اپنی دو لڑکیوں کے ساتھ اناوہ سے آ گئی تھیں۔ ان دونوں کا نام کملا اور امادئی تھا۔ کملا کا بیاہ ہو چکا تھا۔ امادئی ابھی کنواری تھی۔ دونوں آفتاب و مہتاب، منڈپ کے تلے ڈومنیاں اور گائنیں سہاگ

الاپ رہی تھیں۔ گلبیا نائن اور رجمنی کمہارن دونوں شوخ رنگ کی ساڑھیاں پہنے۔ مانگ سیندور سے بھرے گلٹ کے کڑے پہنے چھم چھم کرتی پھرتی تھیں۔ گلبیا شوخ و شنگ اور نوجوان تھی جبکہ جمنی کا سن ڈھل چکا تھا اور سیوتی کا کیا پوچھنا۔ آج اس پر غضب کا نکھار تھا۔ رسیلی آنکھیں فرط مسرت سے متوالی ہو رہی تھیں اور گلابی ساڑھی کی جھلک سے چمپئی رنگ گلابی نظر آتا تھا۔ دھانی مخمل کی کرتی اس پر خوب کھلتی تھی۔ ابھی نہا کر آئی تھی۔ اس لیے ناگن کی سی لٹیں شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ چھیڑ چھاڑ اور چہل سے اتنی فرصت نہ ملتی تھی کہ ذرا بال گندھا لے۔ گہنے باہر سنار صاف کر رہا تھا لیکن ہاتھوں میں صرف کڑے تھے۔ یہ سادگی اس پر ہزار زیوروں سے زیادہ زیب دیتی تھی۔ مہراجن کی بیٹی مادھوی چھینٹ کا لچکے دار لہنگا پہنے آنکھوں میں کاجل لگائے اندر باہر ایک کیے ہوئے تھی

رکمنی نے سیوتی سے کہا ''سنو تمہاری بھاوج کہاں ہیں۔ دکھائی نہیں دیتیں، کیا ہم لوگوں سے پردہ ہے؟'' رام دئی۔ مسکرا کر ''پردہ کیوں نہیں ہماری نظر نہ لگ جائے گی''

یہ کہہ کر چندرا کے کمرے میں وہ پہنچی۔ وہ ایک معمولی سی ساڑھی پہنے چارپائی پر پڑی دروازہ کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھی۔ اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھی سیوتی نے کہا'' یہاں کیا پڑی ہوا کیلئے تمہارا جی نہیں گھبراتا؟''

چندرا: ''اونھ کون جانے، ابھی کپڑے نہیں بدلے''

سیوتی: ''تو بدلتی کیوں نہیں سکھیاں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں''

چندرا: ''ابھی میں نہ بدلوں گی''

سیوتی: ''یہ ضد اچھی نہیں لگتی، سب اپنے دل میں کیا کہتی ہوں گی؟''

چندرا: ''تم نے تو چٹھی پڑھی تھی۔ آج ہی آنے کو لکھا تھا؟''

سیوتی: ''اچھا تو یہ ان کا انتظار ہو رہا ہے۔ یہ کہیے جبھی یہ جوگ سادھا ہے''

چندرا: ''دوپہر تو ہوگئی شاید اب نہ آئیں گے''

اتنے میں کملا اور راما دئی دونوں طرارے بھرتی آ پہنچیں۔

چندرا نے گھونگھٹ نکال لیا اور فرش پر آ بیٹھی۔ کملا اس کی بڑی نند تھی۔

کملا: ''ارے ابھی تو انہوں نے کپڑے بھی نہیں بدلے''

سیوتی: ''بھیا کی بات جوہ رہی ہیں۔ اسی لیے یہ بھیس رچایا''

کملا: ''پاگل ہے انہیں غرض ہوگی تو خود آئیں گے''

سیوتی: ''ان کی دنیا نرالی ہے''

کملا: ''مردوں کی محبت چاہے کتنی کرلو مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالو۔ نہیں تو وہ شیر ہو جاتے ہیں۔ خواہ مخواہ ستانے اور جلانے لگتے ہیں۔ اگر تم ان کی کچھ پرواہ نہ کرو۔ سیدھے منہ بات نہ کرو تو تمہاری ہر طرح سے خاطر کریں گے۔ تم پر جان واریں گے۔ مگر جوں ہی انہیں معلوم ہوا کہ اب اس کے دل میں میری جگہ ہوگئی ہے بس اسی دن سے ان کی نگاہ پلٹ جائے گی۔ سیر کو جائیں گے تو خواہ مخواہ دیر کر کے آئیں گے۔ کھانے بیٹھیں گے تو منہ جوٹھا کر کے اٹھ جائیں گے۔ بات بات پر روٹھیں گے۔ تم روؤ گی تو منائیں گے۔ اور دل میں خوش ہوں گے کہ کیسا شکار ہاتھ لگا ہے۔ تمہارے سامنے دوسری عورتوں کی تعریف کریں گے۔ غرض تمہیں جلانے میں انہیں مزہ آنے لگے گا۔ اب میرے ہی گھر میں دیکھو۔ پہلے اتنی خاطر کیا کرتے تھے کہ کیا بتاؤں۔ ہر دم نوکروں کی طرح ہاتھ باندھے حاضر۔ پنکھا جھلنے کو تیار، ہاتھ سے لقمہ کھلانے کو موجود، یہاں تک کہ (مسکرا کر) پیر دبانے سے بھی عار نہ تھا۔ بات منہ سے نکلی اور پوری ہوئی۔ میں اس وقت اکیلی تھی۔ مردوں کے داؤ پیچ کیا جانوں، دام میں آ گئی۔ سیوتی جھوٹ نہ ماننا۔ اسی دن سے ان کی آنکھ بدل گئی۔ لگے سیر سپاٹے کرنے اور ایک روز روٹھ کر چل دیئے۔ آدھی رات کو گجرا گلے میں ڈالے عطر میں بسے ہوئے گھر آئے۔ بچہ سمجھتے تھے کہ آج پھر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو

گی۔ میں نے لمبی تانی تو رات بھر کروٹ نہ بدلی۔ دوسرے دن بھی نہ بولی۔ آخر لالہ جی آئے۔ پاؤں پر گرے اور گڑگڑائے۔ تب سے میں نے یہ بات گرہ میں باندھ لی ہے کہ کبھی مردوں سے محبت نہ جتاؤ''

سیوتی: ''جیجا جی کو میں نے دیکھا ہے، بھیا کی شادی میں آئے تھے۔ بڑے ہنس مکھ آدمی ہیں''

کملا: ''پاربتی ان دنوں پیٹ میں تھی۔ اس لیے میں نہ آسکی تھی۔ یہاں سے گئے تو لگے تمہاری تعریف کرنے۔ تم کبھی پان دینے گئی تھیں، کہتے تھے کہ میں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا اور خوب خوب باتیں ہوئیں''

سیوتی: ''جھوٹے ہیں زمانے بھر کے لپاڑیے۔ بات یہ ہوئی کہ گلبیا اور رجنی دونوں کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھیں۔ اماں نے کہا وہ کھانا کھا کر گئے ہیں۔ پان بنا کر دے آ۔ میں پان لے کر گئی۔ چارپائی پر لیٹے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھے۔ میں نے پان دینے کو ہاتھ بڑھایا تو میری کلائی پکڑ لی اور کہنے لگا ایک بات سن لو۔ ایک بات سن لو، مگر میں ہاتھ چھڑا کر بھاگی''

کملا: ''نکلی نہ جھوٹی بات، وہی تو میں بھی کہوں کہ ابھی گیارہ برس کی چھوکری نے ان سے کیا باتیں کی ہوں گی۔ مگر نہیں اپنی ہی ضد کیے جائیں۔ مرد بڑے ڈینگیے ہوتے ہیں۔ میں نے یہ کہا میں نے وہ کہا، میرا تو ان باتوں سے جی جلتا ہے، نہیں معلوم انہیں اپنے اوپر جھوٹی تہمت لگانے میں کیا مزہ آتا ہے۔ آدمی جو برا بھلا کرتا ہے اس پر پردہ ڈالتا ہے۔ مگر یہ لوگ کریں گے تھوڑا مگر ڈینگ مارنے کو ہر دم تیار۔ میں تو جب سے ان کی ایک بات بھی سچ نہیں مانتی''

اتنے میں گلبیا نے آکر کہا ''تم تو یہاں ٹھاڑھی بتلات ہو اور تمہاری سکھی تمکا آنگن میں بلاتی ہیں''

سیوتی: ''دیکھو بھائی اب دیر نہ کرو گلبیا! ان کے صندوق سے کپڑے تو نکال

دے'' کملا چندرا کا سنگھار کرنے لگی۔ سیوتی سہیلیوں کے پاس آئی ہے۔

رکمنی بولی: ''واہ بہن خوب! وہاں جا کر بیٹھ رہیں، تمہاری دیواروں سے ہنسیں بولیں کیا؟''

سیوتی: ''کملا بہن چلی گئیں تھیں۔ ان سے بات چیت ہونے لگی۔ دونوں آ رہی ہیں''

رکمنی: ''لڑکوری ہیں نہ؟''

سیوتی: ''تین ہوئے تھے۔ ایک پارسال مر گیا تھا۔ دو موجود ہیں''

رام دئی: ''مگر کاٹھی بہت اچھی ہے''

چندا کنور: ''مجھے ان کا مانک بہت پسند آیا۔ جی چاہتا ہے چھین لوں''

سیتا: ''مانک واقعی بہت اچھا ہے، دونوں بہنیں ایک سے ایک بڑھ کر ہیں''

رکمنی: ''آ گئی طبیعت پر، اما دئی مرد نہ ہوئیں نہیں تو تم پر جان دینے لگتیں''

سیتا: ''دوسروں پر تو وہ جان دے جس کا دولہا کم رو ہو۔ یہاں تو لاکھ دو لاکھ میں ایک ہے۔ رکمنی کے شوہر ذرا رنگ کے گہرے ہیں اور نقشہ بھی سڈول نہیں تھا''

رکمنی ''صورت لے کر چاٹی نہیں جاتی''

سیتا: ''وہ تو دل ہی جانتا ہوگا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ چاہے روکھی روٹی کھانے کو ملے، جھونپڑے میں رہنا پڑے مگر صورت دیکھتے ہی سب دکھ دور ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ بھجنگی صورت دیکھ کر بخار چڑھ آئے۔ جی متلانے لگے''

سیوتی: ''سیتا کو ایشور نے برا اچھا دیا ہے۔ اس نے سونے کی گئیو پوجی تھی''

رکمنی: (جل کر) ''گورے چمڑے سے کچھ نہیں ہوتا''

سیتا ''تمہیں کالا ہی پسند ہوگا''

سیوتی: ''مجھے کالا بر ملتا تو زہر کھا لیتی''

رکمنی ''یوں کہنے کو جو چاہے کہہ لو مگر سچ پوچھو تو آرام کالے ہی دولہا سے ملتا ہے''

سیوتی: ''آرام کہیں خاک ملتا ہے، گھن سا آ کے لپٹ جاتا ہوگا''

رکمنی: ''یہی تو تمہاری لڑکپن کی باتیں ہیں۔ تم نہیں جانتی خوبصورت مرد ہمیشہ اپنے ہی بناؤ سنگھار میں لگا رہتا ہے۔ اسے اپنی بیوی کا کچھ خیال نہیں رہتا۔ اگر عورت بے حد خوبصورت ہو تو خیر ورنہ تھوڑے ہی دنوں میں اس سے دور بھاگنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں ایسی دوسری عورتوں کے دل پر آسانی سے قابو پا سکتا ہوں۔ بے چارہ کالا کم رو آدمی خوبصورت بیوی پا جاتا ہے تو سمجھتا ہے تو سمجھتا ہے مجھے ہیرے کی کان مل گئی ہے۔ صورت کی کسر وہ پیار اور خاطر داری سے پوری کرتا ہے۔ اس کے دل کو ہمیشہ یہ دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ میں ذرا بھی اس سے ترش ہوا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔ میں اگر آدھی رات کو کہوں کہ گرم گرم حلوہ کھلاؤ تو ممکن نہیں کہ اسی وقت حکم کی تعمیل نہ کریں۔ آج کسی گہنے کی فرمائش کر دوں تو گھر بیچ کر حاضر کریں''

چندا کنور: ''دولہا سب سے اچھا وہ جو منہ سے بات نکلتے ہی پوری کرے''

رام دئی: ''تم اپنی بات نہ چلاؤ تمہیں تو اچھے اچھے گہنوں سے سروکار ہے۔ دولہا کیسا ہی ہو''

سیتا: ''نا معلوم کوئی اپنے مرد سے کسی چیز کی فرمائش کیسے کرتا ہے۔ کیا لحاظ نہیں معلوم ہوتا''

رکمنی: ''تم بے چاری کیا فرمائش کرو گی، کوئی بات تو پوچھے''

سیتا: ''میرا تو انہیں دیکھ کر ہی جی بھر جاتا ہے۔ گہنے کپڑے کی طرف طبیعت ہی نہیں جاتی''

سیوتی: ''سیتا کا خوب جوڑ ہے''

رام دئی: ''جوڑ تو پوچھو تو چندا کنور اور کلونت رائے کا ہے''

سیوتی: ''یہ انہیں دباتی ہوں گی تو بے چارے گھگیانے لگتے ہوں گے''

چندرا کنور: ’’بھاری بھر کم گداز جسم کی نازنین تھی۔ کلونت رائے منحنی اور ضعیف القامت تھے‘‘

رام دئی: ’’اپنی قسمت کو کوستے ہوں گے کہ ایسی دیوانی کہاں سے پائی‘‘

چندرا کنور: ’’جب دیکھو بدہضمی کا شکار، دو چپاتیاں کھائیں اور بدہضمی، ناک میں دم‘‘

سیوتی: ’’بے چارے تم سے ڈرتے ہوں گے‘‘

سیتا: ’’ان کے سامنے بچے معلوم ہوتے ہیں، یہ چاہیں تو انہیں گود میں کھلائیں‘‘

رکمنی (جل کر) ’’بس سارے زمانے میں ایک تم اچھی ہو اور ایک تمہارا دولہا باقی سب بے جوڑ‘‘

سیتا: ’’تمہیں کاہے کو کڑوا لگتا ہے‘‘

اتنے میں ایک اور نازنین جلوہ افروز ہوئیں۔ گہنے سے گوندنی کی طرح لدی ہوئی، پر تکلف جوڑا پہنے، عطر میں بسی ہوئی، سرمہ سے لیس، آنکھوں سے شوخی و شرارت برس رہی تھی۔

رام دئی: ’’آؤ رانی تمہاری ہی کسر تھی‘‘

رانی: ’’کیا کروں نگوڑی نائن سے کسی طرح پیچھا ہی نہیں چھوٹتا تھا۔ کلثوم کی ماں آئی تب جا کے جوڑا باندھا‘‘

سیتا: ’’تمہاری جاکٹ پر نثار ہونے کو جی چاہتا ہے‘‘

رانی: ’’اس کا قصہ کچھ نہ پوچھو، کپڑا دیئے مہینہ بھر ہوا، دس بارہ مرتبہ درزی سی کر لایا، مگر کبھی آستین ڈھیلی کر دی، کبھی بخیہ بگاڑ دیا، کبھی چنت خراب کر دی، بارے ابھی چلتے چلتے دے گیا ہے‘‘

سیوتی: ’’البیلے یہی ہیں، یا کہیں گئے ہوئے ہیں‘‘

رانی: ’’میری بلا جانے جیسے گنتا گھر رہے ویسے رہے بدلیں‘‘

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ مادھوی غل مچاتی ہوئی آئی ''بھیا آئے ہیں ان کے ہمراہ جیجا جی بھی ہیں۔ او ہو ہو''

رانی: ''کیا رادھا چرن آئے ہیں کیا؟''

سیوتی: ''ہاں چلو ذرا بھابی کو سندیسا دے آؤں۔ کیوں رے کہاں بیٹھے ہیں''

مادھوری، ''اسی بڑے کمرے میں جیجا جی پگڑی باندھے ہیں۔ بھیا کوٹ پہنے ہیں، مجھے بھیا نے روپیہ دیا ہے، یہ کہہ کر اس نے مٹھی کھول کر دکھائی''

رانی: ''ستو اب منہ میٹھا کراؤ''

سیوتی: ''کیا میں نے کوئی منت مانی تھی؟''

سیتا؟ ''باچھیں کھلی جا رہی ہیں۔ آنکھوں میں نشہ آ گیا ہے''

رانی: ''یہ سادگی تم پر پھبتی ہے، خاصی پری معلوم ہوتی ہو''

سیوتی: (چندرا کے کمرے میں آ کر بولی) ''لو بھابی تمہارا شگون ٹھیک اترا''

چندرا: ''کیا آ گئے ذرا جا کر اندر بلا لو''

سیوتی: ''ہاں مردانے میں چلی جاؤں۔ تمہارے بہنوئی صاحب بھی پدھارے ہیں''

چندرا: ''باہر بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟ کسی کو بھیج کر بلا لیتیں۔ نہیں تو دوسروں سے باتیں کرنے لگیں گے''

یکا یک کھڑاؤں کی آواز آئی اور رادھا چرن آئے ہوئے دکھائی دیئے۔ سن چوبیس پچیس سال سے زائد نہ تھا۔ بہت ہی خوش رو سرخ و سفید، انگریزی تراش کے بال، فرنچ تراش کی داڑھی، کھڑی مونچھیں، لونڈر کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ بدن پر صرف ایک ریشمی مہین کرتا تھا۔ آ کر چارپائی پر بیٹھ گئے اور سیوتی سے بولے، ''کیوں ستو! ہفتہ بھر سے خط نہیں بھیجا''

سیوتی: ''میں نے سوچا اب تو آ ہی رہے ہو کیا خط بھیجوں''

یہ کہہ کر سیوتی وہاں سے کھسک گئی۔ چندرا نے گھونگھٹ اٹھا کر کہا ''وہاں جا کر بھول جاتے ہو'' رادھا چرن (گلے سے لگا کر) ''جب ہی سینکڑوں کوس سے چلا آتا ہوں''

## 8

## بارات کی رخصتی

بارات دھوم دھام سے گئی اور تین دن مقیم رہی۔ شب و روز عیش و مسرت کے جلسے ہوتے رہے۔ پہلے دن آدھی رات کے وقت منڈپ کے نیچے شادی کے مراسم ادا کیے گئے۔ تمام باراتی فرش پر بیٹھے۔ برجن ایک شنگرفی رنگ کی ساڑھی پہنے، لمبا سا گھونگھٹ نکالے آئی اور کملا چرن کی بغل میں بٹھائی گئی، ہون ہوا پھر سنسکرت کے شلوک پڑھے گئے۔ جو دولہا دلہن کی سمجھ میں بالکل نہ آئے۔ عورتوں نے سہاگ کے گیت گائے۔ پھر دولہا دلہن نے سات بار ہون کنڈ کو طواف کیا۔ اس کے بعد دولہا کہبیر میں گیا۔ جہاں عورتوں نے اسے برجن کا جوٹھا پان کھلایا تا کہ وہ ہمیشہ بیوی کا غلام بنا رہے۔ اس سے غزل پڑھنے کی فرمائش کی گئی جس کی تعمیل وہ نہ کر سکا۔ پھر اس کی وضع قطع اور حسب و نسب کی ہنسی آرائی گئی۔ اس کی ماں اور باپ اور بہنوں کو خدا معلوم کیسی فحش گالیاں دیں جو دولہا کو ذرا بھی ناگوار معلوم نہیں ہوئیں۔ بلکہ وہ خوش ہو ہو کر سنتا رہا۔ دوسرے دن دس بجے کلیوا کی رسم ادا ہوئی۔ نوشہ مع خاص خاص رشتہ داروں کے آنگن میں آ بیٹھا۔ باسی پوریاں اس کے سامنے رکھی گئیں۔ منشی سنجیون لال نے پانچ اشرفیاں تھالی کے پاس رکھ دیں اور چمکار کر کہا بیٹا کھاؤ، مگر نوشہ نے ہاتھ نہ بڑھایا۔ تب ایک سونے کی انگوٹھی، ایک دوشالہ جس پر زریں کام ہوا تھا، ایک چاندی کا گلاس، دو چاندی کے کٹورے اور کچھ برتن لا کر رکھ دیئے گئے۔ تس پر بھی نوشہ نے پوریوں کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ سنجیون لال نے رادھا چرن کی طرف دیکھا۔ مگر بجائے اجازت کے ممانعت پائی۔ سنجیون لال گھر

میں گئے۔ ایک موہن مالا اور دو انگوٹھیاں اور لائے اور پھر نوشہ سے ماحضر تناول فرمانے کی درخواست کی۔ رادھا چرن نے کملا سے کہا" خاموش کیوں بیٹھے ہو۔ جو کچھ عرض کرنا ہو تو صاف صاف دیوان صاحب سے کرو" کملا کے بہنوئی پران ناتھ نے کہا" نوشہ کی طرف سے میں ایک گھوڑے کی درخواست کرتا ہوں"

سیاما سے کہا" یہ لوگ پورے ڈاکو ہیں۔ دو ڈھائی سو ڈکار گئے۔ اب سواری کے لیے گھوڑا مانگتے ہیں" سیاما نے جو با دیا" دے دیجئے گھوڑا ان کی خواہش تو پوری ہو" منشی جی نے مجبور ہو کر اپنی ٹمٹم کا گھوڑا دیا۔ تب کملا چرن نے نوالہ اٹھایا اور گن کر پانچ بار لقمہ منہ تک لے گئے۔ شام کے وقت باراتیوں کی ضیافت ہوئی، تکلف سے کھانا رکھا گیا۔ لوگ کھانے بیٹھے۔ ڈومنیاں اندر گانے لگیں۔

آپ تو لالہ نیوتے میں آئے، میا کسے دے آئے، ارے بہنا کسے دے آئے

پھوپھی تمہاری مد کی ماتی، اس کو نہ کیوں لائے آئے، کسے سونپ آئے

منشی پیارے لال نے فرمایا پران ناتھ گالیوں کے از حد مشتاق ہیں، ڈومنیوں نے دوسرے گیت میں ان کی خبر لی۔

بہن تمہاری بہت سیانی، گھر گھر ہوت بکھان، تم ہو ابھی نادان

سیج پہ اس کی نس دن آتے دس دس سجن سجان تم ہو ابھی نادان

ڈپٹی شیاما چرن نے فرمایا پیارے لال کو کیوں چھوڑتی ہو، ان کی بہن کا نام چمپا ہے

ڈومنیوں نے گایا

چمپا تیری کلیاں بہت سہانی رنگ تیرا مجھے بھایا، رنگ تیرا مجھے بھایا

تری صورتیا چت سے نہ اترے تو نہ مجھے اپنایا رنگ تیرا مجھے بھایا

اسی طرح فرمائشیں کر کر کے لوگ گالیاں سنا کیے۔ کوئی باقی نہ بچا۔ یہاں تک کہ گاتے گاتے ڈومنیوں کا جی اکتا گیا۔ مگر سننے والوں کو سیری نہ ہوئی۔

منشی پیارے لال نے پھر تازہ فرمائش کی۔ ڈومنیوں نے فحش گالیاں دینی شروع کیں۔ آخر آٹھ بجتے بجتے کھانا ختم ہوا۔ تیسرے دن رخصتی کا وقت تھا۔ علی الصبح باراتی اصحاب منڈپ کے نیچے جمع ہوئے۔ منشی سنجیون لال اور ان کے رشتہ دار باراتیوں سے بغلگیر ہوئے۔ نو بجے بارات رخصت ہوگئی۔ آئی تھی کس شان سے، گئی بالکل اس طرح جیسے کوئی شکست خوردہ فوج، گائنوں نے رخصتی کے گیت گائے۔ منشی شیاما چرن نے گالیاں گانے کے لیے ایک اشرفی انعام دی۔ کملا چرن اندر گئے۔ ساس نے چھاتی سے لگایا۔ چلتے وقت پانچ اشرفیاں نذر کیں۔ شادی بڑی خوبی سے انجام کو پہنچی۔ شہر میں چاروں طرف واہ واہ کی دھوم مچ گئی۔

## 9

## حسد

پرتاپ چند نے برجن کے گھر آنا جانا شادی کے کچھ دن پہلے ہی سے ترک کر دیا تھا۔ شادی کے کسی کام میں شریک نہ ہوا حتیٰ کہ محفل میں بھی نہ گیا۔ مغموم صورت بنائے منہ لٹکائے اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔ منشی سنجیون لال، سوشیلا، سباما سب خاشامدیں کر کر ہار گئے۔ مگر اس نے بارات کی طرف رخ تک نہ کیا۔ آخر منشی جی کبیدہ خاطر ہو گئے اور پھر اس سے کچھ نہ کہا۔ یہ کیفیت شادی ہونے تک تھی۔ شادی کے بعد تو اس نے ادھر کا راستہ ہی ترک کر دیا۔ مدرسہ جاتا تو اس طرح کتراتا ہوا بھاگتا، گویا سامنے کوئی شیر بیٹھا ہوا ہے۔ یا جیسے تقاضا کرنے والے مہاجن کے سامنے سے مقروض آدمی نظریں بچا کر گزر جاتا ہے، برجن کی تو پرچھائیں سے بھاگتا۔ اگر کبھی اسے اپنے گھر میں دیکھ پاتا تو اندر قدم نہ رکھتا۔ ماں سمجھاتی ”بیٹا تم برجن سے بولتے چالتے کیوں نہیں کیوں اس سے من موٹا کیے ہوئے ہو۔ وہ آ آ کر گھنٹوں روتی ہے کہ میں نے کیا کیا ہے کہ جس سے یہ ناراض ہو گئے۔ دیکھو تم اور وہ کتنے دنوں تک ایک ساتھ رہے۔ تم اسے کتنا پیار کرتے تھے۔ یکا یک تم کو یہ کیا ہو

گیا۔ اگر تم اسی طرح روٹھے رہے تو غریب لڑکی کی جان پر بن جائے گی۔ سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے۔ ایشور جانتا ہے مجھے اس کو دیکھ کر ترس آتا ہے۔ سوائے تمہارے ذکر کے اسے جیسے کوئی دوسری بات ہی نہیں معلوم" پرتاپ آنکھیں نیچی کیے یہ سب سنتا اور چپ چاپ سرک جاتا۔

پرتاپ اب کمسن بچہ نہ تھا۔ اس کی زندگی کے پودے میں شباب کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے بہت دنوں سے، اسی وقت سے جب کہ اس نے ہوش سنبھالا، اپنے طفلانہ خوابوں میں برجن کی زندگی کو اپنی زندگی میں شیر و شکر کی طرح ملا لیا تھا۔ ان دلفریب اور سہانے خوابوں کا اس بے دردی اور بے رحمی سے خاک میں ملایا جانا اس کے نازک دل کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ جو اپنے خیال میں برجن کا سب کچھ تھا کہیں کا نہ رہا اور وہ جس نے برجن کو ایک لمحہ کے لیے بھی خیال میں جگہ نہ دی، سب کچھ ہو گیا۔ اس خیال سے اس کے دل میں جھنجلاہٹ پیدا ہوتی اور جی چاہتا کہ جن لوگوں نے میرا طلسم خواب توڑا اور میری زندگی کی آرزوئیں یوں مٹی میں ملائی ہیں انہیں بھی جلاؤں اور رسلاؤں۔ سب سے زیادہ غصہ اسے جس پر آتا وہ غریب سوشیلا تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی یہ حالت ہوگئی کہ جب مدرسہ سے آتا تو کملا چرن کے متعلق کوئی نہ کوئی روایت ضرور بیان کرتا۔ خصوصاً اس وقت جب کہ سوشیلا بیٹھی ہوتی۔ اس غریب کا دل دکھانے میں اسے خاص مزہ آتا۔ اگرچہ جھوٹ بولنے کی اسے عادت نہ تھی۔ جو کچھ وہ کہتا وہ حقیقت ہوتی۔ مگر نادانستہ طور پر اس کا طرز بیان اور انداز تقریر کچھ ایسا دلخراش ہوجاتا کہ سوشیلا کے جگر میں تیر کی طرح چبھ جاتا۔ آج میاں کملا چرن تپائی کے اوپر کھڑے تھے۔ سر آسمان سے باتیں کرتا تھا مگر بے حیا اتنے کہ جب میں نے ان کی طرف اشارہ کیا تو کھڑے کھڑے ہنسنے لگے۔ آج بڑا مزہ آیا۔ کملا نے ایک لڑکے کی گھڑی اڑا دی۔ اس نے ماسٹر صاحب سے شکایت کی۔ اس کے قریب ہی یہی حضرت بیٹھے ہوتے تھے۔ ماسٹر نے تلاشی لی تو آپ

کے ازار بند میں گھڑی ملی۔ پھر کیا تھا بڑے ماسٹر کے یہاں نالش ہوئی۔ وہ سنتے ہی گھبرا اٹھے اور کوئی تین درجن قمچیاں رشید کیں۔ سڑ اسڑ، سڑ اسڑ تمام اسکول تماشا دیکھتا تھا۔ جب تک قمچیاں پڑا کیں حضرت داد فریاد فرماتے رہے، مگر باہر نکلتے ہی کھلکھلانے لگے۔ اور مونچھوں پر تاؤ دیا۔ چچی نے سنا آج لڑکیوں نے عین مدرسے کے دروازے پر کملا چرن کو پیٹا۔ مارتے مارتے بیدم کر دیا۔ علی ہذا آئے دن اسی قسم کی وارداتیں بیان کرنے کو مل جاتیں۔ سوشیلا سنتی اور سن سن کر کڑھتی۔ ہاں پرتاپ اس قسم کی کوئی بات برجن کے سامنے نہ کرتا۔ اگر وہ گھر میں بیٹھی بھی ہوتی تو جب تک وہ چلی نہ جائے یہ تذکرہ نہ چھیڑتا۔ اسے منظور نہ تھا کہ میری کسی بات سے اسے صدمہ پہنچے۔ پرتاپ کی روایتوں کی تائید اتفاقیہ طور پر منشی سنجیون لال نے بھی کئی بار کی۔ کبھی کملا بازار میں بلبل لڑاتے مل جاتا۔ کبھی شہدوں کے ساتھ سگریٹ پیتے پان چباتے بدوضعی سے گھومتا ہوا نظر آ جاتا۔ منشی جی داماد کی یہ کیفیت دیکھتے تو گھر آتے ہی بیوی پر غصہ اتارتے۔ یہ سب ہی تمہاری کرتوت ہے۔ تمہیں رنجھی ہوئی تھیں کہ گھر اور بر دونوں اچھے ہیں۔ انہیں اس وقت یہ خیال نہ رہتا کہ جتنا الزام سوشیلا پر ہے کم از کم اتنا ہی مجھ پر ہے۔ وہ بے چاری تو چار دیواری میں بند تھی۔ اسے کیا خبر کہ لڑکا کس قماش کا ہے۔ سامدرک ودیا تھوڑی پڑھی تھی۔ اس کے ماں باپ کو شریف دیکھا۔ اس پر عالی خاندان، ذی رتبہ راضی ہو گئی۔ مگر منشی جی نے محض کاہلی اور سہل انگاری کی وجہ سے چھان بین نہیں کی۔ حالاں کہ انہیں اس کے بہت سے مواقع حاصل تھے۔ اور منشی جی کے بے شمار بھائی اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں جو اپنی پیاری لڑکیوں کو اسی طرح آنکھیں بند کر کے کنوئیں میں دھکیل دیا کرتے ہیں۔

سوشیلا کو برجن سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہ تھی۔ برجن اس کی جان تھی۔ اس کا دین تھی، اس کا ایمان تھی، اس میں اس کی جان بستی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں کا نور اور اس کے دل کا سرور تھی۔ اس کا سب سے بڑا ارمان یہ تھا کہ میری پیاری برجن کسی اچھے

گھر جائے۔ اس کے ساس سسر دیوی دیوتا ہوں۔ اس کا شوہر شرافت کا پتلا اور شری رام چندر جی کی طرح سوشیل ہو۔ اس پر کسی آزار کی پرچھائیں بھی نہ آنے پائے۔ اس نے مر مر کر بڑی منتوں سے یہ لڑکی پائی تھی اور اس کی یہ آرزو تھی کہ اس رسیلی آنکھوں والی اپنی بھولی بھالی لڑکی کو مرتے دم تک اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دوں گی۔ اپنے داماد کو بلاؤں گی، اپنے گھر رکھوں گی، برجن کے بچے ہوں گے، ان کی پرورش کروں گی، داماد مجھے اماں کہے گا میں اسے لڑکا سمجھوں گی، جس دل میں یہ ارمان ہوں اس پر ایسی ایسی دل آزار اور دلخراش باتوں کا جو کچھ اثر ہوگا ظاہر ہے۔

افسوس! غریب سوشیلا کے سارے ارمان خاک میں مل گئے۔ اس کی ساری آرزوؤں پر اوس پڑ گئی۔ کیا سوچتی تھی اور کیا ہو گیا۔ اپنے دل کو بار بار سمجھاتی کہ ابھی کیا ہے۔ سمجھ آجائے گی تو یہ سب باتیں آپ ہی چھوڑ دے گا۔ مگر ایک شکایت کا زخم بھرنے نہ پاتا کہ پھر کوئی تازہ واردات سننے میں آجاتی۔ اس طرح زخم پر زخم پڑتے گئے۔ ہائے نہیں معلوم برجن کے بھاگ میں کیا بدا ہے۔ کیا یہ حسن و شعور کی پتلی، میرے گھر کا اجالا، میرے جسم کی جان، اس بد قماش آوارہ شخص کے ساتھ زندگی کاٹے گی، کیا میری شیاما اسی گدھ کے پالے پڑے گی۔ یہ سوچ کر سوشیلا رونے لگتی۔ اور گھنٹوں روتی، پہلے برجن کو کبھی کبھی ڈانٹ ڈپٹ بھی دیا کرتی تھی۔ اب بھول کر کوئی بات نہ کہتی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی اسے رحم آجاتا، ایک لمحہ کے لیے بھی نظروں سے دور نہ ہونے دیتی۔ اگر ذرا دیر کے لیے وہ سباما کے گھر چلی جاتی تو اس کے پیچھے لگی خود بھی جا پہنچتی ایسا معلوم ہوتا گویا اسے کوئی چھینے لیے جاتا ہے۔ جس طرح اپنے بچے کو قصائی کے بغدے کے نیچے دیکھ کر گائے کا رواں رواں کانپنے لگتا ہے، اسی طرح برجن کی مصیبت کا خیال کر کے سوشیلا کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو جاتی۔ ان دنوں برجن کو دم بھر کے لیے نگاہوں سے دور کرتے اسے وہ قلق اور گھبراہٹ ہوتی تھی جو چڑیا کو گھونسلے سے بچوں کے کھو جانے پر ہوتی ہے۔

سوشیلا ایک تو یوں ہی دائم المریض تھی۔ اس پر آئے دن کی کوفت اور جلن نے اسے اور بھی گھلا ڈالا۔ بیٹی کی فکر سوہان روح ہوگئی۔ شکایتوں نے کلیجہ چھلنی کر دیا۔ چھ مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ تپ دق کے آثار نمودار ہو گئے۔ پہلے تو ہفتہ عشرہ تک طبیعت پر زور ڈال کر اپنا آزار دل چھپاتی رہی۔ مگر آخر کب تک؟ مرض بڑھنے لگا اور طاقت نے جواب دیا۔ قیدی بستر ہوگئی، حکیم اور ڈاکٹر علاج کرنے لگے، تین چار مہینے میں حالت ایسی نازک ہوگئی کہ معالجوں نے بھی علاج سے ہاتھ اٹھالیا۔ برجن اور سباما شب و روز اس کے پاس بیٹھی رہتیں۔ برجن ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پاتی۔ اسے اپنے پاس نہ دیکھ کر سوشیلا بدحواس سی ہو جاتی اور چیخ چیخ کر رونے لگتی۔ منشی سنجیون لال پہلے تو سرگرمی سے علاج کرتے رہے مگر جب دیکھا کہ کسی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا اور مریضہ کی حالت روز بروز ابتر جاتی ہوتی ہے تو آخر انہوں نے بھی مایوس ہو کر ہمت چھوڑ دی۔ آج سے کئی سال پہلے جب سباما بیمار پڑی تھی، اس وقت سوشیلا نے اس کی تیمارداری بڑی جانفشانی سے کی تھی۔ اب سباما کی باری آئی اور اس نے ہمسائیگی اور بہناپے کا حق پورا کر دیا۔ تیمار داری میں اپنے گھر کا کام کاج بھول گئی۔ دو دو تین تین دن تک پرتاپ سے بولنے تک کی نوبت نہ آتی۔ اکثر وہ بے کھانا کھائے ہی مدرسہ چلا جاتا مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتا۔ سوشیلا کی حالت نے اب اس کی آتش حسد کو بہت مدھم کر دیا تھا۔ حسد کی آگ محسود کی ترقی اور بہتری کے ساتھ تیز اور مشتعل ہوتی جاتی ہے اور اس وقت بجھتی ہے جب محسود کی زندگی کا چراغ بجھ جاتا ہے۔

جس دن برج رانی کو معلوم ہو جاتا کہ آج پرتاپ بلا کھانا کھائے مدرسہ جا رہا ہے، اس دن وہ سب کام چھوڑ کر اس کے گھر دوڑی جاتی اور کھانے کے لیے ضد کرتی مگر پرتاپ اس سے بات تک نہ کرتا۔ اسے روتے چھوڑ کر باہر چلا جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ برجن کو بے خطا سمجھتا تھا مگر ایک ایسے رشتہ کو جو برس چھ مہینے میں منقطع

ہونے والا ہو وہ پہلے ہی سے توڑ دینا چاہتا تھا۔ تنہائی میں بیٹھ کر وہ آپ ہی آپ گھنٹوں پھوٹ پھوٹ کر روتا مگر ضبط کا مادہ اس کے دل میں کچھ ایسا مضبوط تھا کہ وہ اپنے جوش محبت کو ابو سے باہر نہ ہونے دیتا۔

ایک روز وہ مدرسہ سے آ کر اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ برجن آئی اس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے اور لمبی لمبی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسی حسرت اور بے بسی چھائی ہوئی تھی اور نگاہیں کچھ ایسی التجا آمیز تھیں کہ پرتاپ کا ضبط رخصت ہو گیا۔ وہ بیتاب ہو کر اٹھا اور برجن کی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگا۔ برجن نے آواز سنبھال کر کہا ''للو اب اماں نہ جئیں گی میں کیا کروں'' یہ کہتے کہتے وہ پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

پرتاپ یہ خبر سن کر سناٹے میں آ گیا۔ بدحواس دوڑا ہوا برجن کے گھر گیا اور سوشیلا کی چارپائی کے پاس کھڑا ہو کر رونے لگا۔ ہمارا آخری وقت کیسا مبارک ہوتا ہے۔ وہ ہمارے پاس ایسے ایسے بے رخوں کو کھینچ لاتا ہے جو چند دن پہلے ہماری صورت سے بیزار تھے اور جنہیں سوائے اس طاقت کے دنیا کی کوئی دوسری طاقت زیر نہ کر سکتی تھی۔ ہاں یہ وقت ایسا ہی طاقتور ہے وہ جو بڑے بڑے طاقتوروں اور سرکشوں اور دشمنوں کو ہمارا مطیع کر دیتا ہے۔ جن پر ہم کبھی فتح نہ پا سکتے تھے ان پر یہ وقت ہم کو فتح مند بنا دیتا ہے۔ جن پر کسی وقت کسی بھی ہتھیار سے غالب نہ آ سکتے تھے، ان پر یہ وقت باوجود قویٰ کے مضمحل ہو جانے کے ہم کو غالب کر دیتا ہے۔

آج پورے سال بھر کے بعد پرتاپ نے اس گھر میں قدم رکھا۔ سوشیلا کی آنکھیں بند تھیں مگر چہرہ ایسا شگفتہ تھا جیسے صبح کے وقت کا کنول، آج صبح سے وہ رٹ لگائے ہوئے تھی کہ للو کو دکھا دو، سباما نے اسی لیے برجن کو بھیجا تھا۔

سباما نے کہا ''بہن آنکھیں کھولو للو کھڑا ہے''

سوشیلا نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے دونوں بازو فرط محبت سے پھیلا دیئے۔

پرتاپ کے دل سے کینہ کا آخری نشان بھی محو ہو گیا۔ اگر ایسے وقت میں بھی کوئی انسان دل میں کینہ کا غبار رہنے دے تو وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ پرتاپ بے فرزندانہ جوش سے آگے بڑھا اور سوشیلا کی آغوش محبت میں جا لپٹا اور دونوں آدھ گھنٹے تک روتے رہے۔ سوشیلا اسے دونوں بازوؤں میں ایسے دبائے ہوئے تھی گویا وہ کہیں بھاگا جا رہا ہے۔ وہ اس وقت اپنے تئیں ملامتیں کر رہا تھا۔ میں ہی اس دکھیا کا جان لیوا ہوں۔ میں نے حسد کے کمینے جذبہ سے مغلوب ہو کر اسے اس نوبت کو پہنچایا ہے۔ میں ہی اس پریم کی مورت کا قاتل ہوں۔ جوں جوں یہ خیالات اس کے دل میں آتے گئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ آخر سوشیلا بولی ''للو! میں دو ایک دن کی اور مہمان ہوں، میرا جو کچھ کہا سنا ہو وہ معاف کر دو''

پرتاپ کی آواز قابو میں نہ تھی، کچھ جواب نہ دے سکا۔

سوشیلا پھر بولی ''نہ جانے کیوں تم مجھ سے ناراض ہو، تم ہمارے گھر نہیں آتے۔ ہم سے باتیں نہیں کرتے۔ جی تمہیں پیار کرنے کو ترس ترس کے رہ جاتا ہے، مگر تم میری ذرا خبر بھی نہیں لیتے، بتاؤ اپنی غریب چچی سے کیوں روٹھے ہوئے ہو۔ ایشور جانتا ہے میں تمہیں ہمیشہ اپنا لڑکا سمجھتی رہی ہوں، تمہیں دیکھ کر میری چھاتی پھول اٹھتی تھی''

یہ کہتے کہتے نقاہت کے باعث اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔ جیسے افق کی اتھاہ وسعت میں اڑنے والی مرغابی کی آواز ہر لحظہ مدھم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی آواز کا صرف خیال باقی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح سوشیلا کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے صرف سائیں سائیں رہ گئی۔

## 10

## سوشیلا کی وفات

تین دن اور گزر گئے۔ سوشیلا کے جینے کی اب کوئی آس نہ رہی، تینوں دن منشی سنجیون لال اس کے پاس بیٹھے ہوئے اس کی تشفی کرتے رہے۔ وہ ذرا دیر کے لیے

بھی کسی کام کو چلے جاتے تو وہ بے قرار ہونے لگتی اور رو رو کر کہتی کہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ان کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بھی اسے تسکین نہ ہوتی۔رہ رہ کر ایک مجنونانہ جوش سے ان کا ہاتھ پکڑ لیتی اور مایوسانہ لہجہ میں کہتی مجھے چھوڑ کر کہیں چلے تو نہ جاؤ گے۔منشی جی گو استقلال کے عادی تھے مگر ایسی باتیں سن کر آبدیدہ ہو جاتے۔ذرا ذرا دیر میں سوشیلا پر ایک غشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی، پھر چونکتی اور ادھر ادھر وحشت آمیز نگاہیں ڈال کر پوچھنے لگتی۔وہ کہاں گئے؟ کیا چھوڑ کر چلے گئے؟ بعض اوقات نسیان کا ایسا غلبہ ہو جاتا کہ منشی جی بار بار کہتے کہ میں بیٹھا ہوا ہوں گھبراؤ نہیں، مگر اسے یقین نہ آتا، انہیں کی طرف تکتی اور پوچھتی کہاں ہیں، یہاں تو نہیں ہیں کہاں چلے گئے، ذرا دیر میں جب ہوش آ جاتا تو خاموش ہو جاتی اور رونے لگتی، تینوں دن اس نے برجن سبا ما پرتاپ اور تینوں میں سے ایک کو بھی یاد نہ کیا۔وہ سب کے سب ہر دم اس کے پاس کھڑے رہتے۔مگر ایسا معلوم ہوتا کہ وہ بجز منشی جی کے اور کسی کو پہچانتی ہی نہیں۔جب برجن بہت بے قرار ہو جاتی اور اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر رونے لگتی تو وہ ذرا آنکھیں کھول دیتی اور پوچھتی کون ہے؟ برجن؟ بس اور کچھ نہ پوچھتی، جیسے بخیل کے دل میں مرنے کے وقت سوائے اپنے دفینہ کے اور کسی بات کا دھیان نہیں رہتا، اسی طرح ہندو عورت اپنے آخری لمحوں میں سوائے اپنے پتی کے اور کسی کا دھیان نہیں کر سکتی کیوں کہ بخیل کو اپنی دولت سے جتنی محبت ہے اس سے بدرجہا محبت پتی برتا عورت کو اپنے شوہر سے ہوتی ہے۔

کبھی کبھی سوشیلا یکا یک چونک پڑتی، اور ہکا بکا ہو کر پوچھتی ''ارے یہ کون کھڑا ہے، یہ کون کھڑا ہے، یہ کون بھاگا جا رہا ہے، انہیں کیوں لیے جاتا ہے۔نہ میں نہ جانے دوں گی'' یہ کہہ کر منشی جی کے دونوں ہاتھوں کو زور سے پکڑ لیتی۔ایک لمحہ میں جب بے خودی دور ہو جاتی۔تب شرما کر کہتی میں سپنا دیکھ رہی تھی۔جیسے کوئی تمہیں لیے جاتا تھا۔دیکھو تمہیں ہماری قسم جانا نہیں، نہیں معلوم کہاں لے جائے گا۔ایں،

منشی جی کا کلیجہ مسوسنے لگتا۔ اس کی طرف نہایت محبت آمیز شفقت اور درد سے بھری ہوئی نگاہ ڈال کر بولتے ۔نہیں میں نہ جاؤں گا،تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گا ۔سباما اس کی حالت دیکھتی اور روتی کہ اب یہ کچھ دیر کی اور مہمان ہے،ضرورت نے اس کی شرم وحیا سب دور کردی تھی ۔منشی جی کے سامنے گھنٹوں بے حجاب کھڑی رہتی ۔

چوتھے دن سوشیلا کی حالت سنبھل گئی ۔منشی جی کو یقین ہوگیا کہ بس یہ فیصلہ ہے، چراغ گل ہونے سے پہلے بھڑک اٹھتا ہے۔ سویرے ہی جب منہ دھو کر گھر میں آئے تو سوشیلا نے انہیں اشارے سے اپنے پاس بلالیا اور بولی کہ مجھے اپنے ہاتھ سے تھوڑا سا پانی پلادو، آج اس پر نسیان کا غلبہ بہت کم معلوم ہوتا تھا۔ اس نے برجن، سباما اور پرتاپ سب کو بخوبی پہچانا اور برجن کو بڑی دیر تک چھاتی سے لگائے روتی رہی۔ جب پانی پی چکی تو سباما سے کہا بہن ذرا ہم کو اٹھا کر بٹھا دو۔ سوامی جی کے پیر چھو لوں، پھر نہ جانے کب ان کے درشن ہوں گے۔

سباما نے روتے ہوئے اسے ہاتھوں کے سہارے ذرا سا اٹھا دیا۔ پرتاپ اور برجن سامنے کھڑے تھے۔سوشیلا نے منشی جی سے کہا ’’ذرا نزدیک آجاؤ‘‘ منشی جی اس وقت فرط محبت اور درد سے بے خود ہو کر اس کے سینے سے لپٹ گئے اور روتے ہوئے بولے ’’تم گھبراؤ نہیں، ایشور چاہے گا تم آج ہی اچھی ہو جاؤ گی‘‘ سوشیلا نے مایوسانہ انداز سے مسکرا کر کہا ہاں اچھی ہو جاؤں گی، ذرا اپنا پیر بڑھا دو، میں چوم لوں منشی جی ہچکچا رہے تھے اس وقت سباما پہلی بار روتے ہوئے بولی ’’پیر بڑھا دیجئے۔ ان کے دل کی آرزو بھی نکل جائے‘‘ تب منشی جی نے پیر بڑھا دیا۔سوشیلا نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کئی بار چوما اور تب ان پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی اور دم کی دم میں دونوں پیر گرم آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ پتی برتا عورت نے پریم کے موتی شوہر کے قدموں پر نثار کر دیئے۔

جب ذرا آواز قابو میں آئی تو اس نے برجن کا ایک ہاتھ پکڑ کر منشی جی کے ہاتھ میں

دیا اور نہایت دھیمی آواز میں بولی ''سوامی جی آپ کے ساتھ بہت دن رہی اور زندگی کا بہت سکھ اٹھایا۔ اب پریم ناطہ ٹوٹتا ہے۔ اب میں دم بھر کی مہمان ہوں، پیاری برجن کو تمہیں سونپے جاتی ہوں۔ میری یہی نشانی ہے اس پر ہمیشہ مہربانی کی نگاہ رکھنا۔ میری قسمت میں اپنی پیاری بچی کا سکھ دیکھنا نہ لکھا تھا۔ اسے میں نے کبھی کوئی کڑی بات نہیں کہی۔ کبھی کڑی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ یہ میری زندگی کا پھل ہے، ایشور کے لیے تم اس کی طرف سے کبھی بے سدھ نہ ہو جانا'' یہ کہتے کہتے ہچکیاں بندھ گئیں اور غشی سی آ گئی۔

جب ذرا پھر افاقہ ہوا تو اس نے سباما کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے اور رو کر بولی ''بہن برجن تمہارے سپرد ہے، تم اس کی ماں کی جگہ ہو، للو! ایشور کرے تم جگ جگ جیو، اپنی بہن برجن کو بھولنا مت، وہ تمہاری غریب ماں کی بہن ہے۔ تم میں اس کی جان بستی ہے۔ اسے رلانا مت، کڑھانا مت، اسے کبھی کڑوی بات مت کہنا۔ اس سے کبھی نہ روٹھنا، اس کی طرف سے بے خبر مت ہونا۔ نہیں تو وہ رو رو کر جان دے دے گی، اس کی بھاگ میں نہ جانے کیا بدا ہے، مگر تم اسے اپنی سگی بہن سمجھ کر سدا اس کی دل جوئی کرتے رہنا، میں ذرا دیر میں تم لوگوں کو چھوڑ کر چلی جاؤں گی، مگر تمہیں میری قسم اس کی طرف سے من موٹا نہ کرنا۔ تم نے اور تمہاری ماں نے اسے آدمی بنایا ہے اور تمہیں اس کا بیڑا پار لگاؤ گے، میرے دل میں بڑے بڑے ارمان تھے، میری لالسا تھی کہ تمہارا بیاہ کر دوں گی، تمہارے بچے کھلاؤں گی، مگر بھاگ میں کچھ اور ہی بدا تھا''

یہ کہتے کہتے پھر بے ہوشی اور نقاہت نے اس پر غلبہ کیا۔ سارا گھر رو رہا تھا، مہریاں، مہراجنیں، نوکر چاکر سب اس کا جس گا رہے تھے، وہ عورت نہیں دیوی تھی

ردھیا: ''اتنے دن ٹہل کرتے ہوئے مگر کبھی کڑی بات نہیں کہی''

مہراجن: ''ہم کو بیٹی کی طرح مانتی تھیں، کھانا کیسا ہی پکا کر رکھ دوں مگر کبھی زچ

نہیں ہوئیں۔ جب بات کرتیں مسکرا کے، مہراج جب آتے تو انہیں جرور سیدھا دلواتی تھیں‘‘

اسی طرح کی باتیں سب کرر ہے تھے، دوپہر کا وقت آیا مہراجن نے کھانا بنایا۔ مگر کھاتا کون؟ منشی جی بڑے اصرار سے گئے اور منہ جوٹھا کر کے چلے آئے۔ پرتاپ نے وہاں سے نہ ٹلنے کی قسم کھالی تھی، برجن اور سباما کو بھوک کہاں؟ سوشیلا کبھی برجن کو پیار کرتی پرتاپ کو چومتی اور کبھی اپنی بیٹی کہہ کہہ کر روتی۔ سہ پہر کے وقت اس نے سب نوکروں کو بلایا اور ان سے خطا معاف کروائی۔ جب یہ سب چلے گئے تو سوشیلا سباما سے بولی ’’بہن پیاس بہت لگی ہے ان سے کہہ دو ذرا اپنے ہاتھ سے پھر پانی پلا دیں‘‘ منشی جی پانی لائے اور سوشیلا نے ایک گھونٹ بمشکل تمام حلق سے نیچے اتارا۔ اور ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے اسے امرت پلا دیا۔ اس کا چہرہ روشن ہو گیا، آنکھوں میں رس بھر آیا، شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بولی، ’’میں کیسی بھاگوان ہوں جو تمہاری گود میں مرتی ہوں‘‘ یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی، جیسے کوئی بات کہنا چاہتی ہو اور لحاظ سے نہیں کہتی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی’’ اگر تم سے کچھ مانگوں تو دو گے؟‘‘

منشی جی نے متعجب ہو کر پوچھا ’’تمہیں مانگنے کی ضرورت ہے؟ شوق سے کہو‘‘

سوشیلا: ’’تم میری بات کبھی نہ ٹالتے تھے‘‘

منشی جی: ’’مرتے دم تک کبھی نہ ٹالوں گا‘‘

سوشیلا: ’’ڈر لگتا ہے کہیں نہ مانو تو‘‘

منشی جی: ’’تمہاری بات اور میں نہ مانوں‘‘

سوشیلا: ’’میں تم کو نہ چھوڑوں گی، ایک بات بتلا دو، سلی مر جائے گی تو اسے بھول جاؤ گے؟‘‘

منشی جی: ’’ایسی باتیں نہ کرو دیکھو برجن روتی ہے‘‘

سوشیلا: ''بتلادو مجھے بھولو گے تو نہیں؟''

منشی جی: ''تمہاری یاد مرتے دم تک تازہ رہے گی''

سوشیلا نے اپنے مرجھائے رخسار منشی جی کے ہونٹوں پر رکھ دیئے اور دونوں باہیں ان کے گلے میں ڈال دیں۔ پھر برجن کو قریب بلا کر آہستہ آہستہ سمجھانے لگی، ''دیکھو بیٹی لالہ جی کا ہر دم کہنا ماننا، ان کی سیوا خوب من لگا کر کرنا، گھر کا سارا بوجھ تمہارے ہی اوپر ہے اب تمہارے سوا کون سنبھالے گا''

یہ کہہ کر اس نے شوہر کی طرف دردآمیز نگاہوں سے دیکھا ''میں اپنے من کی بات نہیں کہنے پائی جی ڈوبا جا رہا ہے''

منشی جی: ''تم ناحق پس وپیش کرتی ہو''

سوشیلا: ''تم میرے ہو کہ نہیں؟''

منشی جی: ''تمہارا اور مرتے دم تک تمہارا''

سوشیلا: ''ایسا نہ ہو کہ مجھے بھول جاؤ اور جو چیز میری تھی وہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں چلی جائے''

منشی جی: ''(اشارہ سمجھ کر) اس کا ذکر ہی کیوں کرتی ہو۔ جب تک جیوں گا تمہارا ہی رہوں گا''

سوشیلا نے پھر برجن کو بلایا اور باپ کے قدموں پر گرا دیا اور مارے ضعف کے بے دم ہو گئی۔ برجن اور پرتاپ رونے لگے۔ سہاما نے سمجھا کہ ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ گیا۔ منشی جی نے کانپتے ہوئے سوشیلا کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ سانس دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ مہراجن کو بلا کر اب انہیں زمین پر لٹا دیا۔ تپ دق نے ہڈیاں تک سکھا ڈالیں تھیں۔

اندھیرا ہو چلا تھا۔ سارے کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا، حسرت ناک، وحشت ناک سناٹا، وہ سناٹا جو دلوں کو ملول اور متفکر بنا دیتا ہے۔ رونے والے روتے تھے مگر

گلا دبا کر، باتیں ہوتی تھیں مگر دبی آوازوں میں، سوشیلا زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ تن نازک جو کبھی ماں کی گود میں پلا۔ کبھی محبت کے آغوش میں لیٹا، کبھی پھولوں کی سیج پر سویا، اس وقت زمین پر پڑا ہوا تھا، ابھی تک نبض آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ منشی جی فرطِ الم و یاس سے مایوس اس کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ دفعتاً سوشیلا کے اعضاء میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے سر اٹھا دیا اور دونوں ہاتھوں سے منشی جی کا پیر پکڑ لیا اور روح پرواز کر گئی۔ دونوں ہاتھ ان کے پیروں کا حلقہ کیے ہی رہ گئے۔

رونے والو رو و، کیونکہ سوائے رونے کے تم اور کر ہی کیا سکتے ہو۔ تمہیں اس وقت کوئی کتنا ہی سمجھائے مگر تمہاری آنکھیں آنسوؤں کی باڑھ کو نہ روک سکیں گی، رونا تمہارا فرض ہے، زندگی میں رونے کے موقعے شاذ ہی ملتے ہیں۔ کیا اس موقع پر بھی تمہاری آنکھیں بخل کر جائیں گی۔ آنسوؤں کے تار بندھے ہوئے تھے۔ سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں کہ مہراجن چراغ جلا کر کمرے میں لائی۔ ذرا دیر پہلے سوشیلا کی زندگی کا چراغ بجھ چکا تھا۔

## 11

## برجن کی رخصتی

رادھا چرن رڑکی کالج سے نکلتے ہی مرادآباد میں انجینئر مقرر ہو گئے اور چندر ران کے ساتھ مرادآباد کو چلی۔ پریم وتی نے بہت روکنا چاہا مگر جانے والے کو کون روک سکتا ہے، سیوتی کب کی سسرال جا چکی تھی۔ یہاں گھر میں اکیلی پریم وتی رہ گئی۔ اس کے سر گھر کا کام کاج تھا۔ آخر یہ رائے ہوئی کہ برجن کی رخصتی کا پیغام دیا جائے۔ ڈپٹی صاحب رخصتی کے سخت خلاف تھے، مگر گھر کے معاملات میں پریم وتی کا حکم قطعی ہوتا تھا۔

سنجیون لال نے پیغام منظور کر لیا۔ کچھ دنوں سے وہ تیرتھ جاترا کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سوشیلا کے مرنے کے بعد رفتہ رفتہ انہوں نے تمام دنیاوی تعلقات

ترک کر دیئے تھے۔ دن بھر کمرے میں آسن مارے بھگوت گیتا اور یوگ بششٹ اور دوسری معرفت کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے اور شام ہوتے ہی گنگا اشنان کو چلے جاتے۔ وہاں سے رات گئے لوٹتے اور دو چار لقمے کھا کر سو جاتے۔ اکثر پرتاپ چند بھی ان کے ساتھ گنگا نہانے کو جاتا اور اگرچہ پورے سولہ سال کا بھی نہ ہوا تھا مگر مناسبت فطری کہو یا ورثہ پدری یا فیض صحبت کہ ابھی سے اسے اسرار معرفت پر غور و خوض کرنے میں بے حد لطف حاصل ہوتا تھا۔ گیان اور حقیقت کے تذکرے سنتے سنتے اس کا رجحان بھی بھگتی کی جانب ہو چلا تھا۔ اور بعض اوقات منشی جی سے ایسے دقیق مسائل پر بحث کرتا کہ وہ حیرت میں آ جاتے۔

برج رانی پر سباما کی تعلیم کا اس سے بھی گہرا اثر پڑا تھا جتنا پرتاپ چند پر منشی جی کی صحبت اور تعلیم تھا۔ اس کا پندرھواں سال تھا جو ہمارے شباب کی پہلی منزل سمجھی جاتی ہے۔ اس سن میں لڑکیوں پر شوق سنگار کا جنون سوار ہوتا ہے۔ ان کے انداز طریق میں بجائے طفلانہ شوخی کے ایک متانت آمیز چلبلا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ دلوں میں شباب کی امنگیں پیدا ہوتی ہیں اور نگاہوں سے بجائے سادگی اور شوخی کے ایک جذبہ آمیز رسیلا پن برسنے لگتا ہے مگر برج رانی ابھی تک وہی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اس کا چہرہ معصومیت کی تصویر تھا۔ ایک ایک انداز سے سادگی ٹپکتی تھی۔ ہاں رفتار میں ایک دل آویز دھیرا پن اور طرز کلام میں لبھانے والی شیرینی پیدا ہو گئی تھی۔ باتیں سننے والے پر موہنی منتر پڑھ دیتی تھیں۔ منہ اندھیرے اٹھتی اور سب سے پہلے منشی جی کا کمرہ صاف کر کے ان کے پوجا پاٹ کا سامان قرینہ سے رکھ دیتی۔ پھر رسوئی کے دھندے میں لگ جاتی دوپہر کا وقت اس کے لکھنے پڑھنے کا تھا۔ سباما سے اسے جتنی محبت تھی اتنی تو شاید اسے اپنی ماں سے بھی نہ رہی ہو۔ اس کی مرضی برجن کے لیے قانون ہی تھی۔

سباما کی تو صلاح تھی کہ ابھی رخصتی نہ کی جائے۔ مگر منشی جی مصر تھے اور بدائی کی

تیاریاں ہونے لگیں۔ جوں جوں مصیبت کی گھڑی سر پر آتی جاتی برجن کی بے قراری بڑھتی جاتی۔ رات دن رویا کرتی۔ کبھی باپ کے پیروں پڑتی۔ کبھی سباما کے پیروں سے لپٹ جاتی۔ مگر بیاہی لڑکی پرائے گھر کی ہو جاتی ہے۔ اس پر کسی کا کیا اختیار۔

پرتاپ چند اور برجن کتنے ہی دنوں تک بھائی بہنوں کی طرح ایک ساتھ رہے تھے۔ مگر اب برجن کی آنکھیں اسے دیکھتے ہی نیچے کو جھک جاتیں۔ پرتاپ کو بھی یہی کیفیت تھی۔ گھر میں بہت کم آتا تھا۔ کبھی ضرورت سے آتا تو گویا کچھ اس طرح دلہن کی طرح نگاہیں نیچی کیے ہوئے سمٹا ہوا آتا۔ اس کی نگاہوں میں وہ راز محبت چھپا ہوا تھا جسے وہ کسی متنفس حتیٰ کہ برجن پر بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک روز شام کے وقت رخصتی کو صرف تین دن رہ گئے تھے۔ پرتاپ کسی ضرورت سے اندر گیا اور اپنے کمرے میں لیمپ جلانے لگا کہ برجن آئی۔ اس کا آنچل آنسوؤں سے تر تھا۔ اس نے جو دو برس کے بعد پرتاپ کی طرف پر آب نگاہوں سے دیکھا کر کہا۔

''للو مجھ سے کیسے صبر ہوگا؟''

پرتاپ نے مردانہ ضبط سے کام لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔ اس کی آواز بھاری نہ ہوئی، واعظانہ لہجے میں بولا

''ایشور تمہیں صبر کی طاقت دے گا''

برجن کی گردن جھک گئی۔ آنکھیں زمین میں گڑ گئیں اور ایک دبی ہوئی سسکی نے حسرت و درد کا وہ دفتر بیان کر دیا اور جو زبان سے ناممکن تھا۔

رخصتی کا دن لڑکیوں کے لیے عجیب حسرت کا دن ہوتا ہے۔ بچپن کی سکھیاں، سہیلیاں، ماں باپ، بھائی بند گھر کے مانوس در و دیوار، ان سب سے ناطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ خیال کہ میں پھر اس گھر میں آؤں گی، اسے مطلق تسکین نہیں دیتا تھا، کیوں

کہ اب وہ آئے گی تو مہمان کی حیثیت سے آئے گی۔ ان لوگوں سے جدا ہونا جن کے درمیان زندگی کے گہوارے میں کھیلنا اور بےفکریوں کے چمن میں سیر کرنا نصیب ہوا ہو، اس کے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اب تک وہ دنیا کے فرائض اور پابندیوں سے آزاد رہتی تھی۔ مگر آج سے اس کے سر پر ایسا بوجھ لدتا ہے جو مرتے دم تک اٹھانا پڑے گا۔

برجن کا سنگھار کیا جا رہا تھا۔ نائن اس کے پیروں میں مہاور رچا رہی تھی۔ کوئی اس کے سر کے بالوں کو گوندھ رہی تھی۔ کوئی جوڑے میں عطر بسا رہی تھی۔ مگر جس کے لیے یہ تیاریاں کی جا رہی تھیں وہ زمین پر موتی کے دانے یوں بکھیر رہی تھی گویا ان کا کچھ مول ہی نہیں ہے۔

اتنے میں باہر سے پیغام آیا، ساعت ٹلی جا رہی ہے جلدی کرو

سباما پاس کھڑی تھی۔ برجن اس کے گلے لپٹ گئی اور وہ جوش محبت جواب تک دبی ہوئی آگ کی طرح سلگ رہا تھا یکبارگی ابل پڑا جیسے کوئی آنچ میں تیل ڈال دے۔

ذرا دیر میں پالکی دروازہ پر آئی۔ برجن پاس پڑوس کی عورتوں سے گلے ملی۔ سباما کے پیر چھوئے اور تب دو تین عورتوں نے اسے پالکی کے اندر بٹھا دیا۔ ادھر پالکی اٹھی ادھر سباما غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ گویا اس کے جیتے جی کوئی اس کی جان نکال کر لیے جاتا تھا۔ گھر سونا ہو گیا تھا، سینکڑوں عورتوں کا جمگھٹ تھا۔ مگر ایک برجن کے نہ ہونے سے مکان پھاڑے کھاتا تھا۔

## 12

## کملا چرن کے دوست

جیسے سیندور کی سرخی سے مانگ رچ جاتی ہے۔ اسی طرح برج رانی کے آنے سے پریم وتی کے گھر کی رونق دوبالا ہو گئی۔ سباما نے اسے ایسے گن سکھائے تھے کہ جس نے اسے دیکھا موہا گیا یہاں تک کہ سیوتی کی سہیلی رانی کو پریم وتی کے سامنے اقرار

کرنا پڑا کہ تمہاری چھوٹی بہو نے ہم سبھوں کا رنگ پھیکا کر دیا۔ سیوتی اس سے دن بھر باتیں کرتی اور اس کا جی نہ بھرتا۔ اسے اپنے گانے پر ناز تھا، مگر اس میدان میں بھی برجن بازی لے گئی۔

اب کملا چرن کے دوستوں نے تقاضا کرنا شروع کر دیا کہ بھئی نئی دلہن گھر میں لائے ہو کچھ دعوت جلسہ کی بھی فکر ہے۔ سنتے ہیں نہایت ہی حسین بیوی پائی ہے۔ کملا چرن کو روپیہ تو سسرال میں ملا ہی تھا جیب کھنکھنا کر بولے۔

''اجی دعوت لو، شرابیں اڑاؤ، آنکھیں سینکو، ہاں بہت ہو حق نہ مچانا ورنہ کہیں اندر خبر ہو تو سمجھیں یہ شہدا ہے۔ جب سے وہ گھر میں آئی ہیں، ایں جانب کا قافیہ تنگ ہے۔ سنتا ہوں انگریزی، فارسی، سنسکرت، الم غلم سب گھوٹے بیٹھی ہیں۔ ڈرتا ہوں کہیں انگریزی میں پوچھ بیٹھی یا فارسی میں بات چیت شروع کر دی تو سوائے بغلیں جھانکنے کے اور کیا کروں گا۔ اس لیے ابھی کنی کاٹتا پھرتا ہوں''

یوں تو کملا چرن کے دوستوں کی تعداد لامحدود تھی۔ شہر کے جتنے کبوتر باز کنکوے باز شہدے تھے، سب ان کے دوست تھے۔ مگر دلی دوستوں میں صرف پانچ آدمی تھے اور سب کے سب فاقہ مست، آوارہ، ان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ میاں مجید تھے۔ کچہری میں عرائض نویس تھے۔ جو کچھ ملتا شراب کی نذر کرتے۔ دوسرا نمبر حمید خاں کا تھا۔ ان ذات شریف نے ورثہ میں بڑی دولت پائی تھی مگر تین سالوں میں سب کچھ ارباب نشاط کی نذر کر دیا۔ اب یہ وطیرہ تھا کہ بج دھج کر شام کو گلیوں کی خاک چھانتے پھرتے اور وقت ضرور پر بازار حسن کی دلالی بھی کیا کرتے۔ اس بازار کے خریداروں اور بیوپاریوں میں ان کی بڑی رسائی تھی۔ تیسرے حضرت سعید حسین تھے۔ ایک ہی شاطر اور قمار باز۔ سینکڑوں کا داؤ لگانے والے، بیوی کے زیوروں پر ہاتھ صاف کرنا روزمرہ کا مشغلہ تھا۔ باقی دو صاحب رام سیوک اور چندو لال کچہری میں ملازم تھے۔ تنخواہیں تھوڑی مگر بالائی آمدنی وافر، نصف شراب کی

نذر کرتے اور نصف شاہدان حسن فروشاں کی خاطر و مدارت میں صرف ہوتی۔ گھر کے لوگ فاقے کرتے یا بھیک مانگتے انہیں صرف اپنے عیش سے کام تھا۔

مشورہ تو ہو ہی چکا تھا۔ آٹھ بجے شب ڈپٹی صاحب لیٹے تو یہ پانچوں حضرات جمع ہوئے اور دور چلنے لگا۔ پانچوں پینے میں حاتم تھے دائم الخمر، جب ذرا سرور گھٹا تو بہکی بہکی باتیں ہونے لگیں۔

مجید: ''کیوں بھئی کملا چرن! سچ کہنا دیکھ کر جی خوش ہو گیا یا نہیں؟''

کملا: ''اب آپ بہکنے کیوں لگے؟''

مجید: ''بتلا کیا اپنا سر دوں، کبھی سامنے جانے کا اتفاق بھی تو ہوا ہو، کل کواڑ کی دراڑ سے ایک نظر دیکھ لیا تھا۔ ابھی تک تصویر نگاہوں کے سامنے پھر رہی ہے''

چندو لال: ''میرے یار! تو بڑا بلند اقبال مند ہے''

کملا: ''ایسا بے قرار رہا کہ گرتے گرتے بچا، بس پری سمجھ لو''

مجید: ''تو بھائی دوستی کس کام آئے گی، ایک نظر ہمیں بھی دکھا دو''

سعید: ''بے شک دوستی کے یہی معنی ہیں کہ آپس میں کوئی پردہ نہ رہے۔ دوئی کا مسئلہ ہی القط ہو جائے''

چندو لال: ''دوستی میں کیا پردہ، انگریزوں کو دیکھو، بیوی ڈولی سے اتری نہیں کہ یار دوست ہاتھ ملانے لگے''

رام سیوک: ''مجھے تو بن دیکھے چین نہ آئے گا، ہیں تو پختہ؟''

کملا: (ایک دھول لگا کر) ''زبان کاٹ لی جائے گی سمجھے؟''

رام سیوک: ''کچھ پرواہ نہیں، آنکھیں تو دیکھنے کو رہیں گی''

مجید: ''بھئی کملا چرن برا ماننے کی کوئی بات نہیں، اب اس وقت تمہارا فرض ہے کہ دوستوں کی فرمائش پوری کرو''

کملا: ''ارے تو میں کب انکار کرتا ہوں''

چندو لال: ''واہ میرے شیر! یہ مردوں کی سی باتیں ہیں، تو ہم لوگ بن ٹھن کر آ جائیں کیوں؟''

کملا: ''جی ذرا منہ پر کالکھ لگا لیجئے گا، بس اتنا ہی کافی ہے''

سعید: ''تو کارِ خیر میں تاخیر کیوں ہو؟ آج ہی کی ٹھہری نا؟''

کملا: ''آج ہی سہی، مگر یاد رہے کہ کل آپ سب اصحاب کی بیویوں کے درشن کروں گا، اس وقت اگر کسی نے چیں چپڑ کیا تو بندہ کا پوپش مبارک اور اس کا فرق نا مبارک''

سب کے سب ''منظور بہ دل و جان منظور''

رام سیوک: ''یہاں کیا دھرا ہے، پانچ بچوں کی ماں اور اس پر پھٹے حال، خاصی چڑیل معلوم ہوتی ہے''

چندو لال: ''یہاں اس سے بھی بدتر حال ہے، تین مہینے سے چوتھیا آ رہا ہے مگر کس مردود نے کوڑی کی دوا لی ہو، صورت دیکھتے ہی بخار چڑھ جاتا ہے''

سعید: ''ایں جانب یہ روگ ہی نہیں پالتے، چند روزہ انتظام مستقل انتظام سے بہتر ہوتا ہے''

ادھر تو مے ناب کے دور چل رہے تھے اور ادھر برجن پلنگ پر لیٹی ہوئی خیالوں میں غرق تھی، بچپن کے دن کیسے اچھے ہوتے ہیں، کاش! وہ دن پھر آ جاتے۔ آہ! کیسی دلچسپ زندگی تھی، دنیا ناز، پیار اور محبت کا گہوارہ تھی، کیا وہ کوئی دوسری دنیا تھی، کیا ان دنوں کی چیزیں بہت خوبصورت ہوتی تھیں۔ انہی خیالوں میں آنکھ ذرا جھپک گئی اور بچپن کا ایک واقعہ پیش نظر ہو گیا۔ للو نے اس کی گڑیا مروڑ دی۔ اس نے اس کی کتاب کے دو ورق پھاڑ ڈالے، تب للو نے اس کی پیٹھ میں زور سے چٹکی لی اور باہر بھاگا، وہ رونے لگی اور للو کو کوس رہی تھی کہ سباما اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے آئی اور بولی۔

''کیوں بیٹی! اس نے تمہیں مارا ہے نا؟ یہ بہت مار مار کر بھاگتا ہے، آج اس کی مرمت کرتی ہوں، دیکھوں کہاں مارا ہے''

للو نے ڈبڈبائی آنکھوں سے برجن کی طرف دیکھا اور برجن نے مسکرا کر کہا

''مجھے انہوں نے کہاں مارا، یہ مجھے کبھی نہیں مارتے''

یہ کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا، اپنے حصہ کی مٹھائی کھلائی اور پھر دونوں مل کر کھیلنے لگے، وہ زمانہ اب کہاں؟ اس زمانہ کی یاد ایک خواب حسرت کی یاد ہے۔

رات زیادہ گزر گئی تھی۔ یکا یک برجن کو ایسا معلوم ہوا کہ سامنے والی دیوار کوئی دھمد ھمار ہا ہے۔ اس نے کان لگا کر سنا، برابر آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی رک جاتیں کبھی پھر آنے لگتیں، ذرا دیر میں مٹی گرنے لگی۔ خوف کے مارے برجن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ جی کڑا کر کے مہراجن کو جھنجھوڑنے لگی۔ گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ اتنے میں مٹی کا ڈھیلا سامنے گرا اور مہراجن چونک کر اٹھ بیٹھی، دونوں کو یقین ہو گیا کہ چور آئے ہیں، مہراجن ایک چالاک عورت تھی، سمجھی کہ چلاؤں گی تو جاگ ہو جائے گی، اس نے سن رکھا تھا کہ چور سیندھ میں پیر ڈال کر گھستے ہیں، اس نے ایک ڈنڈا اٹھا لیا کہ جب پیر ڈالے گا تو ایسا تاک کر ماروں گی کہ ٹانگ ٹوٹ جائے گی، مگر چور نے پیر کے بجائے سیندھ میں سر ڈالا۔ مہراجن تاک میں تو تھی ہی ڈنڈا اچھال دیا اور کھٹ کی آواز آئی، چور نے سر کھینچ لیا اور یہ کہتا سنائی دیا''

اف مار ڈالا کھوپڑی بھنا گئی''

پھر کئی آدمیوں کے ہنسنے کی آواز آئی اور اس کے بعد سناٹا ہو گیا۔ اتنے میں اور لوگ جاگ پڑے اور باقی رات گپ شپ میں کٹی۔

سویرے جب کملاچرن گھر میں آئے تو آنکھیں سرخ تھیں اور سر میں آماس تھا۔

مہراجن نے نزدیک جا کر دیکھا اور آ کر برجن سے بولی۔

''بہو ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گی؟''

برجن: ''برا کیوں مانوں گی، کہو کیا کہتی ہو؟''

مہراجن: ''رات جو سیندھ پڑی تھی وہ چوروں نے نہیں لگائی تھی''

برجن: ''پھر کون تھے؟''

مہراجن: ''گھر ہی کے بھیدی تھے، باہر کا کوئی نہیں تھا''

برجن: ''کیا کسی کہار کی شرارت تھی؟''

مہراجن: ''نہیں کہاروں میں ایسا کوئی نہیں ہے''

برجن: ''پھر کون تھا، صاف صاف کیوں نہیں کہتیں؟''

مہراجن: ''میرے دھیان میں تو چھوٹے بابو تھے، میں نے وہ لکڑی دے پھینکی تھی، وہ ان کے سر میں لگی ہے، سر پھولا ہوا ہے''

اتنا سنتے ہی برجن کے تیور بدل گئے اور چہرہ تمتما گیا، غضبناک ہو کر بولی ''مہراجن! ہوش سنبھال کر باتیں کرو، تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تمہیں ایسی بات کہنے کا حوصلہ ہوا؟ خود میرے سر پر الزام تھوپ رہی ہو۔ تمہارے بڑھاپے پر ترس آتا ہے، ورنہ اسی وقت تمہیں یہاں سے کھڑے کھڑے نکلوا دیتی۔ تب تمہیں معلوم ہوتا کہ زبان کو قابو میں نہ رکھنے کا یہ پھل ہوتا ہے یہاں سے اٹھ جاؤ، مجھے تمہاری صورت دیکھ کر بخار سا چڑھ آتا ہے، تمہیں اتنا نہ سمجھ پڑا کہ میں کیسی بات زبان سے نکال رہی ہوں۔ انہیں ایشور نے کیا نہیں دیا ہے، سارا گھر ان کا ہے، میں خود ان کی چیری ہوں اور ان کی نسبت سے تم ایسی باتیں کہہ بیٹھیں''

مگر جس بات پر برجن ایسی برہم ہوئی اسی بات پر گھر کے دوسرے آدمیوں کو آسانی سے یقین آ گیا

ڈپٹی صاحب کے کان میں بات پہنچی، وہ کملا چرن کو اس سے زیادہ شریر النفس سمجھتے تھے جتنا وہ فی الواقع تھے، خوف ہوا کہ یہ حضرت کہیں بہو کے زیوروں پر نہ ہاتھ صاف کریں، بہتر ہو کہ انہیں بورڈنگ ہاؤس بھیج دوں

کملا چرن نے یہ تجویز سنی تو بہت چیخے چلائے، مگر کچھ سوچ کر دوسرے دن بورڈنگ ہاؤس چلے گئے۔

برجن کے آنے سے پہلے کئی بار یہ تجویز ہوئی تھی مگر کملا کی ضد کے سامنے ایک بھی پیش نہ گئی۔ یہ بیوی کی نگاہوں میں ذلیل ہو جانے کا خوف تھا جو اب کی بار اسے بورڈنگ ہاؤس لے گیا۔

## 13

## کایا پلٹ

پہلا دن تو کملا چرن نے کسی طرح بورڈنگ ہاؤس میں کاٹا صبح سے شام تک پڑے سویا کی۔ دوسرے دن خیال آیا کہ آج تو نواب صاحب اور تیکھے مرزا کے بٹیروں میں بدا ہوا جوڑ ہے، کیسے کیسے مست پٹھے ہیں کہ دیکھ کر روح وجد کرنے لگے۔ آج ان کی پکڑ دیکھنے کے قابل ہو گی۔ شہر کا شہر پھٹ پڑے تو عجیب نہیں، چہ خوش، شہر کے لوگ تو بہار اڑائیں اور میں یہاں کتابوں سے سر کھپاؤں۔

یہ سوچتے سوچتے اٹھا اور دم کی دم میں بدان کے موقع پر تھا

یہاں آج خلقت کی خلقت جمع تھی۔ خاصا میلہ لگا ہوا تھا، سقے چھڑکاؤ کر رہے تھے، سگریٹ والے، کباب والے، تمبولی سب اپنی اپنی دکانیں لگائے بیٹھے تھے اور شہر کے رنگین مزاج نوجوان ہاتھوں میں بٹیر لیے یا مخملی اڈوں پر بلبلوں کو بٹھائے مٹر گشت کر رہے تھے۔ کملا چرن کے دوستوں کی اس جگہ کیا کمی، لوگ انہیں خالی دیکھتے تو حیرت سے پوچھے ارے راجہ صاحب! آج خالی ہاتھ کیسے، اتنے میں میاں سعید، مجید، حمید وغیرہ نشہ میں چور سگریٹ کے دھوئیں بھکا بھک اڑاتے نظر آئے۔ کملا چرن کو دیکھتے ہی سب کے سب سرپٹ دوڑے اور پانچ کے پانچوں عیوب شرعی کی طرح ان سے لپٹ گئے۔

مجید: ''آج تم کہاں غائب ہو گئے تھے میاں؟ قرآن کی قسم مکان کے سینکڑوں

چکر لگائے ہوں گے"

رام سیوک: "آج کل عید کی راتیں ہیں بھئی، آنکھیں نہیں دیکھتے نشہ سا چڑھا ہوا ہے"

چندو لال: "چین کر رہا ہے پٹھا، جب سے نازنین گھر میں آئی ہے اس مرد خدا نے بازار کی صورت تک نہیں دیکھی جب دیکھئے گھر میں گھسا رہتا ہے خوب چین کر لے یار، دوستوں کی طرف سے بھی بوسے لے لیا کرو"

کملا: "چین کیا کروں، یہاں تو قید میں پھنس گیا، تین دن سے بورڈنگ میں پڑا ہوں"

مجید: "ارے! خدا کی قسم"

کملا: "تیری جان کی قسم! پرسوں سے مٹی پلید ہو رہی ہے، آض سبھوں کی آنکھیں بچا کر نکل بھاگا"

رام سیوک: "اف! مصیبت ہی مصیبت ہے، مگر یار خوب اڑے، وہ مچھندر سپرنٹنڈنٹ جھلا رہا ہوگا"

کملا: "اس معرکہ کے جوڑ چھوڑ کر کتابوں میں سر کون مارتا، اس کی مدتوں سے آرزو تھی"

سعید: "یار آج اڑ آئے تو کیا، حق یہ ہے کہ تمہارا وہاں رہنا ستم ہے، روز تو نہ آسکو گے اور یہاں آئے دن نئی نئی سیریں، نئی نئی دلچسپیاں، کل لال ڈگی پر، پرسوں پریڈ پر، ترسوں بٹیرے کا میلہ، کہاں تک گناؤں"

سعید: "اور بٹیروں کا میلہ نہ دیکھا تو حسرت رہ جائے گی"

سہ پہر کے وقت کملا چرن یاران شاطر سے رخصت ہو کر بادل ناخواستہ بورڈنگ ہاؤس کی طرف چلا۔ دل میں ایک چور سا بیٹھا ہوا تھا۔ دروازہ پر پہنچ کر جھانکنے لگا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نہ ہوں تو لٹک کر کمرہ میں چلا جاؤں، مگر دیکھتا ہے کہ وہ بھی باہر

کی طرف آرہے ہیں۔ دل کو خوب مضبوط کر کے اندر داخل ہوا، سپرنٹنڈنٹ صاحب بولے ''اب تک کہاں تھے؟''

لہجہ ایسا درشت تھا کہ کملا چرن بہ مشکل ترکی بہ ترکی جواب دینے سے باز رہا مغرورانہ انداز سے بولا ''ایک ضرورت سے بازار چلا گیا تھا''

سپرنٹنڈنٹ: ''یہ بازار جانے کا وقت نہیں ہے''

کملا: ''مجھے معلوم نہ تھا آئندہ سے احتیاط رکھوں گا''

رات کو جب کملا چارپائی پر لیٹا تو سوچنے لگا آج تو بچ گیا۔ مگر مزہ تو تب ہے کہ کل بھی بچوں اور پرسوں بھی حضرت کی آنکھوں میں دھول ڈالوں، کل کا نظارہ واقعی قابل دید ہوگا۔ کنکوے آسمان سے باتیں کریں گے۔ اور لمبے لمبے پیچ ہوں گے، نوشہ مرزا بلا کی بازی لگاتا ہے، یہ خیال کرتے کرتے سوگیا۔ دوسرے دن پھر علی الصبح بورڈنگ ہاؤس سے نکل بھاگا۔ یاران دل نواز دل ڈگی پر اس کے منتظر تھے۔ دیکھتے ہی باغ باغ ہو گئے اور پیٹھ ٹھوکی

کملا چرن کچھ دیر تک تو کٹاؤ دیکھتا رہا۔ پھر شوق چرایا کہ کیوں نہ میں بھی اپنے کنکوے منگواؤں اور پنی تیز دستی کے کرتب دکھاؤں۔ سعید نے بھڑکایا کہ بد بد کر لڑاؤ۔ روپیہ ہم دیں گے، چٹ آؤ دیکھا نہ تاؤ، مکان پر آدمی دوڑا دیا، کامل یقین تھا کہ اپنے مانجھے سے یہاں ستھراؤ کر دوں گا، مگر آدمی گھر سے خالی ہاتھ لوٹا، تب تو حضرت کو تاب نہ رہی، بدن میں آگ سی لگ گئی، ہنٹر لے کر دوڑے اور مکان پر آتے ہی کہاروں کو ایک طرف سے سڑ سڑ پیٹنا شروع کر دیا۔ غریب بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ہنٹر پڑے اور بے خطا بے قصور تو چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ اور سارے محلے میں ایک شور سا برپا ہوگیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ ہماری خطا کیا ہے۔ یہاں کہاروں کی خاطر خواہ مرمت کر کے کملا چرن اپنے کمرے میں پہنچے۔ مگر وہاں کی کیفیت دیکھ کر غصہ بخار کے درجہ تک پہنچ گیا۔ پتنگ پھٹے ہوئے تھے۔ چرخیاں

ٹوٹی ہوئیں اور مانجھے کی لچھیاں الجھی ہوئیں، گویا کسی وبا نے ان ہوائی جنگ آوروں کا ستیاناس کر دیا ہو، سمجھ گئے کہ ضرور اماں نے یہ حرکت کی ہے، غصہ سے لال اماں کے پاس آئے اور زور زور سے کہنے لگے

''کیوں اماں! کیا سچ مچ میری جان ہی لینے پر آ گئی ہو، تین دن ہوئے قید خانہ میں بھجوا دیا۔ مگر اتنے پر بھی کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ میری دلچسپی کے جو سامان تھے وہ سب برباد کر ڈالے، کیوں؟''

پریم وتی: (حیرت میں پڑ کر) ''میں نے تمہاری کوئی چیز نہیں چھوئی کیا ہوا؟''

کملا: (بگڑ کر) ''جھوٹوں کے منہ میں کیڑے پڑتے ہیں، اگر تم نے میری چیزیں نہیں چھوئیں تو کس کی مجال ہے جو میرے کمرے میں جا کر میرے کھلونے اور چرخیاں سب توڑ پھوڑ ڈالے، کیا اتنا بھی نہیں دیکھا جا سکتا؟''

پریم وتی: ''تمہارے سر کی قسم! میں نے اس کمرہ میں قدم نہیں رکھا، چلو دیکھو کون کونسی چیزیں ٹوٹی ہیں؟''

یہ کہہ کر پریم وتی تو اس کمرہ کی طرف چلی اور کملا غصہ میں بھرے آنگن میں کھڑے رہے کہ اتنے میں مادھوتی برجن کے کمرے سے نکلی اور ان کے ہاتھ میں ایک رقعہ دے کر چلی گئی لکھا ہوا تھا۔

خطا میں نے کی ہے خطاوار ہوں
سزا دیجیے جو سزاوار ہوں

یہ پرزہ دیکھتے ہی کملا بھیگی بلی بن گیا۔ دبے پاؤں مردانے کی طرف چلا۔ پریم وتی نے پردے کی آڑ سے سسکتے ہوئے نوکروں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کیا تھا۔ اسے منع کیا اور اسی وقت چند اور کنکوے جو بچے ہوئے تھے پھاڑ ڈالے، چرخیاں ریزہ ریزہ کر ڈالیں اور ڈور میں دیا سلائی لگا دی۔ ماں اس کی یہ مجنونانہ حرکت دیکھ رہی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا معاملہ ہے، کہاں تو ابھی انہیں چیزوں کے لیے دنیا سر پر

اٹھائی اور کہاں خود ہی ان کے پیچھے پڑ گیا سمجھی شاید مارے غصے کے یہ حرکت کر رہا ہے۔ مگر کملا کے چہرے سے غصہ مطلق ظاہر نہ ہوتا تھا۔ سنجیدگی سے بولا۔

"میں غصہ میں نہیں ہوں، آج سے پکا ارادہ کرتا ہوں کہ پتنگ کبھی نہ اڑاؤں گا، میری حماقت تھی کہ ان چیزوں کے لیے آپ سے جھگڑ بیٹھا"

جب کملا چرن کمرہ میں اکیلا رہ گیا تو سوچنے لگا۔ بے شک میرے کنکوے اڑانا انہیں ناپسند ہے۔ دل سے نفرت کرتی ہیں ورنہ مجھ پر یہ ظلم ہرگز نہ ہوتا۔ کاش ایک بار ان سے ملاقات ہو جاتی تو پوچھتا کہ تمہاری مرضی کیا ہے۔ ایک تو کوڑھ مغز اس پر اپنی حماقت کے کئی ثبوت دے چکے ہیں۔ سیندوالے معاملے کی خبر انہیں ضرور ہوئی ہو گی۔ انہیں صورت دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ اب تو یہی علاج ہے یا تو ان کی صورت نہ دیکھوں اور نہ اپنی دکھاؤں یا کسی طرح کچھ علم حاصل کروں۔ ہائے! ظالم نے کیسی صورت پائی ہے۔ عورت نہیں حور معلوم ہوتی ہے، کیا کبھی وہ دن بھی ہوں گے کہ میں اسے پیار کروں گا اور میرے پیار کے بدلے وہ مجھ سے پیار کرے گی۔ اس وقت تک شاید میں شادی مرگ ہو جاؤں۔ کیا سرخ سرخ رسیلے ہونٹ ہیں، مگر ظالم ہے رحم تو اسے چھو نہیں گیا ہے۔ کہتی ہے سزا دیجیے جو سزاوار ہوں۔ کیا سزا دوں اگر آ جاؤ تو گلے سے لگا لوں اور ان گنت بوسے لوں۔ یہی تمہاری سزا ہے اور بشرط زندگی کبھی نہ کبھی یہ سزا دوں گا ضرور، اچھا تو اب آج سے پڑھنا چاہیے۔ یہ سوچتے سوچتے اٹھا اور ڈربہ کھول کر کبوتروں کو اڑانے لگا۔ سینکڑوں ہی جوڑے تھے ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر۔ آسمان میں تارے بن کر جائیں اڑیں تو دن بھر اترنے کا نام نہ لیں۔ شہر کے کبوتر باز ایک جوڑے کے بدلے غلامی لکھانے کو تیار تھے۔ مگر چشم زدن میں سب کے سب اڑا دیئے۔ جب ڈربہ صاف ہو گیا تو کہاروں کو یہ حکم دیا کہ اسے اٹھا لے جاؤ اور آگ میں جلا دو ورنہ سب کبوتر اس پر آ بیٹھیں گے۔

کبوتروں کا قصہ پاک کر کے بٹیروں اور بلبلوں کی طرف مخاطب ہوئے۔ اور انہیں

بھی بند قفس سے آزاد کر دیا۔

باہر تو یہ گل کھلا ہوا تھا اور اندر پریم وتی چھاتی پیٹ رہی تھی کہ نہیں معلوم لڑکا کیا کرنے پر آ گیا ہے برجن کو بلا کر کہا

''بیٹی! بچے کو کسی طرح روکو، نہیں معلوم اس نے دل میں کیا ٹھانی ہے'' یہ کہہ کر رونے لگی۔ برجن کو بھی شک ہو رہا تھا کہ ضرور انہوں نے کچھ اور نیت کی ہے ورنہ اس جھلاہٹ کے کیا معنی؟ گو کملا بد شوق تھا۔ بد اخلاق تھا، آوارہ تھا، مگر ان سب عیبوں کے ساتھ اس میں ایک بڑا وصف تھا جس کی کوئی عوت نا قدرہ نہیں کر سکتی۔ اسے برج رانی سے سچی محبت تھی اور اس کا نادانستہ طور پر کئی بار اظہار ہو چکا تھا۔ یہی سبب تھا جس نے برجن کو اتنا دلیر بنا دیا تھا۔ اس نے کاغذ نکالا اور یہ پرزہ لکھ کر باہر بھیجا

''پیارے! یہ خفگی کس پر ہے؟ کیا مجھ پر اور محض اس لیے کہ میں نے عجلت کر کے دو تین کنکوے پھاڑ ڈالے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اتنی سی بات پر ایسے برگشتہ ہو جائیں گے تو ہرگز انہیں ہاتھ نہ لگاتی مگر اب معاف فرمایئے۔ یہ پہلی خطا ہے''

آپ کی

برج رانی

کملا چرن یہ خط پا کر ایسا خوش ہوا گویا ساری دنیا کی دولت ہاتھ لگ گئی۔ جواب دینے کا شوق چرایا۔ مگر قلم ہی نہیں اٹھتا۔ نہ القاب ملتا ہے نہ آداب، نہ اٹھان کا خیال ہوتا ہے، نہ خاتمہ کا، ہرچند چاہتا ہے کہ کوئی عاشقانہ رنگ کا پھڑکتا ہوا خط لکھوں، مگر عقل ذرا بھی نہیں دوڑتی، آج پہلی بار کملا چرن کو اپنی بے علمی اور جہالت پر رونا آ گیا۔ افسوس! میں ایک سیدھا سا خط بھی نہیں لکھ سکتا۔ اس خیال سے وہ رونے لگا اور کمرہ کے دروازے بند کر لیے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔

سہ پہر کے وقت منشی شیاما چرن گھر پر آئے تو سب سے پہلے جس چیز نظر پڑی وہ آگ کا الاؤ تھا۔ نوکروں سے متعجب ہو کر پوچھا۔

''یہ کیسا الاؤ ہے؟''

نوکروں نے جواب دیا ''حضور ڈربہ جل رہا ہے''

منشی جی (گھرک کر) ''اسے کیوں جلاتے ہو، کبوتر کہاں رہیں گے؟''

کہار: ''چھوٹے بابو کا حکم ہے کہ سب ڈربے جلا دو''

منشی جی: ''کبوتر کہاں گئے؟''

کہار: ''سب اڑا دیئے ایک بھی نہ رکھا۔ کنکوے سب پھاڑ ڈالے، ڈور جلا دی، بڑا انکسان کیا''

کہار نے اپنی دانست میں مار پیٹ کا بدلہ لیا۔ غریب سمجھا کہ منشی جی اس نقصان کے لیے کملا چرن کو سخت سست کہیں گے۔ مگر منشی جی نے یہ واقعہ سنا تو سکتے میں آ گئے۔ انہیں جانوروں پر کملا چرن جان دیتا تھا۔ آج یکا یک کیا کایا پلٹ ہو گئی۔ ضرور کچھ دال میں کالا ہے، کہار سے کہا ''بچے کو بھیج دو''

ایک منٹ میں کہار نے آ کر کہا ''ہجور دروجا اندر سے بند ہے، بہت کھٹکھٹایا کھولتے ہی نہیں''

اتنا سننا تھا کہ منشی جی کا خون خشک ہو گیا۔ فوراً شبہ ہوا کہ بچہ نے زہر کھا لیا۔ آج ایک زہر خورانی کے مقدمہ کا فیصلہ کر کے آیا تھا۔ ننگے پاؤں دوڑے اور بند کمرہ کے دروازے پر زور سے لات مار کر کہا ''بچہ ............! بچہ..................!!''

یہ کہتے کہتے گلا پھنس گیا۔ کملا نے باپ کی آواز سنی تو فوراً آنسو پونچھ ڈالے اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ مگر اسے کتنا تعجب ہوا جب منشی جی نے بجائے لعن طعن کرنے کے اسے سینے سے لگا لیا اور گھبرا کر پوچھا

''بچہ.....! تمہیں میرے سر کی قسم! بتا دو تم نے کچھ کھا تو نہیں لیا؟''

کملاچرن نے اس سوال کا مطلب سمجھنے کے لیے منشی جی کی طرف آنکھیں اٹھائیں تو ان میں آنسو تھے۔ منشی جی کو اب یقین کامل ہو گیا ضرور آفت آ گئی، ایک کہار سے کہا

''ڈاکٹر صاحب کو بلا لا، کہنا ابھی چلیے''

اب جا کے کند ذہن کملا باپ کی اس گھبراہٹ کا مطلب سمجھا، دوڑ کر ان سے لپٹ گیا اور بولا۔

''آپ کا شبہ بالکل بے جا ہے آپ کے سر کی قسم! میں بالکل اچھا ہوں''

مگر ڈپٹی صاحب کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ سمجھے یہ مجھے روک کر دیر کرنا چاہتا ہے تا کہ اپنا کام تمام کر لے، منت کر کے بولے

''بچہ! ایشور کے لیے مجھے چھوڑ دو، میں صندوق سے ایک دوا لیتا آؤں، میں کیا جانتا تھا کہ تم اس نیت سے بورڈنگ ہاؤس جا رہے ہو''

کملا: ''بخدا! میں بالکل اچھا ہوں، آپ کا شبہ بالکل غلط ہے۔ میں ایسا غیرت مند ہوتا تو آج ایسا جاہل تھوڑے ہی بنے رہتا۔ آپ خواہ مخواہ ڈاکٹر صاحب کو بلا رہے ہیں''

منشی جی: (کچھ کچھ یقین کر کے) ''کواڑ بند کر کے کیا کر رہے تھے؟''

کملا: ''جی اندر سے ایک خط آ گیا تھا اس کا جواب لکھ رہا تھا''

منشی جی: ''اور یہ کبوتر وغیرہ کیوں اڑا دیئے؟''

کملا: ''اس لیے کہ خوب اطمینان سے پڑھوں۔ انہیں خرافات میں میرا وقت ضائع ہو جاتا تھا آج میں نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ اب آپ دیکھیں گے کہ میں کیسا جی لگاتا ہوں''

بارے ڈپٹی صاحب کے ہوش بجا ہوئے۔ اندر آ کر پریم وتی سے حال پوچھا تو اس نے ساری رامائن کہہ سنائی۔ انہوں نے جب سنا کہ برجن نے غصہ میں آ کر کملا

کے کنکوے پھاڑ ڈالے اور چرخیاں توڑ ڈالیں تو بے اختیار ہنس پڑے اور کملا کی دلچسپیوں کی خانہ بربادیوں کا راز سمجھ میں آ گیا بولے ''قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہو ان لالہ کو درست کر کے چھوڑے گی۔ آج کل دفتر سے آتا ہوں تو اکثر گھر پر ہی بیٹھے پاتا ہوں، کبھی کبھی کتاب بھی کھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ آ گئے حضرت بیوی کے پنجے میں، دیکھ لینا اب سنبھل جائیں گے''

## 14

## بدگمانی

برج رانی کی رخصتی کے بعد سباما کا گھر ایسا سونا ہو گیا گویا قفس سے چڑیا اڑ گئی۔ وہ اس گھر کا اجالا اور جسم کی جان تھی۔ مکان وہی تھا مگر در و دیوار پر حسرت چھائی ہوئی تھی۔ مکین وہی تھے مگر سب کے چہرے افسردہ اور آنکھیں غمناک ہو رہی تھیں۔ گلشن وہی ہے مگر خزاں رسیدہ، رخصی کے بعد مہینہ بھر کے اندر منشی سنجیون لال بھی تیرتھ جاترا کو سدھارے، مال و دولت جو کچھ تھا، پرتاپ کو سونپ دیا، اپنے ساتھ مرگ چھالا، بھگوت گیتا اور چند کتابوں کے سوا اور کچھ نہ لے گئے۔

پرتاپ چندر پرزور محسوسات کا نوجوان تھا، مگر اس کے ساتھ ہی ضبط کی انتہائی قوت بھی اسے حاصل تھی۔ مکان کی ایک ایک چیز اسے برجن کی یاد دلاتی رہتی۔ یہ خیال دل سے ایک لمحہ کے لیے بھی دور نہ ہوتا کہ کاش برجن میری ہوتی تو کیسے لطف سے زندگی بسر ہوتی۔ مگر اس خیال کو وہ دور کرتا رہتا تھا۔ پڑھنے بیٹھتا تو کتاب کھلی رہتی اور خیال کہیں اور جا پہنچتا۔ کھانا کھانے بیٹھتا تو برجن کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگتی۔ جذبہ محبت کی طاقت کو دباتے دباتے یہ حال ہو گیا گویا برسوں کا مریض ہے۔ عشاق کو اپنی تمناؤں کے پورے ہونے کی امید ہو نہ ہو مگر وہ دل ہی دل میں اپنے معشوق کے دیدار کا لطف اٹھاتے رہتے ہیں۔ وہ عالم خیال میں معشوق سے باتیں کرتے ہیں۔ چھیڑتے ہیں۔ روٹھتے ہیں، مناتے ہیں، انہیں تصورات سے انہیں

تسکین ہوتی ہے اور دل کو ایک پر مزہ اور خوشگوار شغل ہاتھ آ جاتا ہے۔ مگر کاش کوئی طاقت انہیں اس خیالی گلشن کی سیر کرنے سے روکے۔ کاش کوئی طاقت انہیں خیال میں بھی تصویر یار کا دیدارنہ کرنے دے۔ تو ان بدقسمت بندگان محبت کی کیا گت ہو گی۔ پرتاپ انہیں بدقسمت شخصوں میں سے تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ چاہتا تو مسرت بخش خیالات کا لطف اٹھا سکتا تھا۔ عالم خیال کی سیر ظاہری دلچسپیوں سے کم لطف انگیز نہیں ہوتی مگر مشکل تو یہ تھی کہ وہ برجن کے خیال کو بھی عاشقانہ جذبات کی آلائش سے پاک رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی تربیت ایسے پاکیزہ اصولوں پر ہوئی تھی اور اسے ایک نیک منش پاک باطن بزرگ کی صحبت سے فیض اٹھانے کے ایسے اچھے موقعے ملے تھے کہ اس کی نگاہوں میں خیالات کی پاکیزگی کی اتنی ہی وقعت تھی جتنی فعلوں کی پاکیزگی کی، یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ برجن کو جسے بارہا بہن کہہ چکا تھا جسے اب بھی بہن سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا، عالم خیال میں بھی ایسے تصورات اور جذبات کا مرکز بناتا جو خباثت سے کیسے ہی پاک ہوں مگر نفس سرکش کی حوصلہ افزائیوں سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ جب تک منشی سنجیون لال موجود تھے اس کا کچھ نہ کچھ وقت ان کے ساتھ گیان اور معرفت کے چرچوں میں کٹ جاتا تھا جس سے روح کو یک گونہ تشفی ہوتی تھی مگر ان کے چلے جانے کے بعد تربیت نفس کے یہ موقعے بھی جاتے رہے۔

سباما اسے ہردم دل گرفتہ پاتی تو اسے بہت صدمہ ہوتا۔ ایک روز اس نے کہا!'' تمہاری طبیعت یہاں نہ لگتی ہو تو کچھ دنوں کے لیے الہ آباد چلے جاؤ۔ وہاں شاید تمہاری طبیعت بحال ہو جائے'' یہ خیال پرتاپ کے دل میں کئی بار پیدا ہوا تھا مگر اس خوف سے کہ اماں کو تنہائی بہت شاق گزرے گی اس نے کبھی اس تجویز پر غور نہیں کیا تھا۔ ماں کی طرف سے اشارہ پایا تو ارادہ پختہ ہو گیا۔ سفر کی تیاریاں کرنے لگا۔ روانگی کا دن مقرر ہو گیا۔ اب سباما کا یہ حال ہے کہ جب دیکھیے پرتاپ کو پردیس میں

رہنے سہنے کے متعلق ہدایتیں کر رہی ہے۔ بیٹا دیکھو کسی سے راڑ مت مول لینا۔ جھگڑنے کی تو تمہاری ویسے بھی عادت نہیں ہے مگر سمجھائے دیتی ہوں، پردیس کوا واسطہ ہے پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ کھانے پینے میں بے احتیاطی نہ کرنا۔ تمہاری یہ بڑی بری عادت ہے کہ جاڑوں میں سرِشام سے سو جاتے ہو۔ پھر کوئی کھانے کے لیے کتنا ہی جگائے سنتے تک نہیں۔ آپ بھی اپاس کرتے ہو اور دوسروں کو بھی اپاس کراتے ہو۔ یہ عادت پردیس میں بنی رہی تو تمہیں رات کا کھانا کاہے کو میسر ہوگا۔ دن کو ذرا دیر کے لیے آرام کرلیا کرنا۔ تمہاری آنکھوں میں تو دن کو جیسے نیند ہی نہیں رہتی۔ اسے جب موقع ملتا بیٹے کو ایسی ہی مادرانہ نصیحتیں کیا کرتی۔

آخر روانگی کا دن آپہنچا۔ گاڑی دس بجے دن کو چھوٹتی تھی۔ پرتاپ نے سوچا برجن سے ملاقات کرلوں۔ پردیس جا رہا ہوں پھر نہ جانے کب ملاقات ہو۔ دل نے گدگدایا اور ماں سے کہہ بیٹھا۔ سباما بہت خوش ہوئی۔ ایک طشت حلوہ اور سموسے اور دو تین قسم کے مربے رکھ کر ردھیا کو دیئے کہ للو کے ساتھ جا۔ پرتاپ نے خط صاف کیا۔ کپڑے بدلے اور بن سنور کر چلے۔ مگر چلنے کو تو چلے۔ اب جوں جوں قدم آگے اٹھتا دل بیٹھا جاتا ہے۔ طرح طرح کے خیالات آرہے ہیں۔ نہ جانے من میں کیا سمجھے کیا نہ سمجھے۔ چار مہینے گزر گئے اس نے مجھے ایک خط بھی تو الگ نہیں لکھا۔ پھر کیوں کر کہوں کہ میرے ملنے سے اسے خوشی ہوگی۔ اجی اب اسے تمہاری فکر ہی کیا ہے۔ تم مر بھی جاؤ تو وہ آنسو نہ بہائے۔ یہاں کی بات ہی اور تھی۔ وہاں کی بات اور ہے۔ اور مجھے یہ حماقت سوجھی کہ نیا سوٹ پہن کر آیا۔ یہ ضرور اس کی نگاہوں میں کھٹکے گا۔ کہیں یہ نہ سمجھے کہ لالہ جی مجھے رجھانے آئے ہیں۔ اسی حیص و بیص میں بڑھتا چلا آتا تھا۔ یہاں تک کہ شیاما چرن کا مکان نظر آنے لگا۔ اور کملا صحن میں چہل قدمی کرتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی پرتاپ کی وہ کیفیت ہوگئی جو کسی چور کی سپاہی کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ فوراً اس مکان کی آڑ میں چھپ گیا اور ردھیا سے بولا تو جا یہ

چیزیں دیتی آئیں ذرا ایک ضرورت سے بازار جا رہا ہوں لوٹتا ہوا آؤں گا، یہ کہہ کر بازار کی طرف چلا۔ مگر دس ہی قدم گیا کہ پھر مہری کو بلایا اور بولا ''مجھے شاید دیر ہو جائے اس لیے ادھر نہ آسکوں گا۔ کچھ پوچھیں تو یہ پرزہ دے دینا'' یہ کہہ کر جیب سے پنسل نکالی اور چند سطریں لکھ کر دے دیں۔ جس سے اس کے قلب کی حالت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے ''میں الہ آباد جا رہا ہوں۔ اب وہیں پڑھوں گا۔ تم سے عجلت کے باعث نہ مل سکا۔ زندہ رہوں گا تو پھر آؤں گا۔ کبھی کبھی اپنی خیر و عافیت سے اطلاع دیتی رہنا'' تمہارا پرتاپ

پرتاپ تو پرزہ دے کر رخصت ہوا اور ردھیا آہستہ آہستہ برجن کے گھر پہنچی۔ وہ اسے دیکھتے ہی دوڑی اور خیر و عافیت پوچھی لالہ کی کوئی چٹھی آئی تھی

ردھیا: ''جب سے گئے چٹھی پتر کچھ نہیں آوا''

برجن: ''چچی تو آرام سے ہیں؟''

ردھیا: ''للو بابو پراگ راج جات ہیں تو ن تنک اداس رہت ہیں''

برجن: (چونک کر) ''للو پراگ جا رہے ہیں؟''

ردھیا: ''ہاں ہم سب بہت سمجھاوا ہیں کہ پردیس میں کہا جیہو مدا کوؤ کی سنت ہیں''

برجن: ''کب جائیں گے؟''

ردھیا: ''آج دس بجے کے ٹیم سے جویا ہیں۔ تم سے بھینٹ کرن آوت رہے۔ تو ان دوار پر آئے کے لوٹ گئے''

برجن: ''یہاں تک آ کے لوٹ گئے۔ دروازہ پر تھا کوئی یا نہیں؟''

ردھیا: ''دوار پر کہاں آئے سڑک پر سے چلے گئے''

برجن: ''کچھ کہا نہیں کیوں لوٹے جاتا ہوں؟''

ردھیا: ''اتنا بولے کہ ہمارا ٹیم چھوٹ جیہے ہنوں ہم جانت ہے''

برج رانی نے گھڑی دیکھی۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ پریم وتی کے پاس جا کر

بولی، ''اماں للو آج الہ آباد جا رہے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو ذرا ان سے ملتی آؤں۔ پھر نہ جانے کب ملنا ہو کب نہ ہو۔ مہری کہتی ہے وہ مجھ سے ملنے آئے تھے مگر وہ سڑک کے اسی پار سے لوٹ گئے''

پریم وتی: ''ابھی نہ بال گندھوائے، نہ مانگ بھروائی، نہ کپڑے بدلے اور جانے کو تیار ہو گئیں''

برجن: ''میری اماں جی آج جانے دیجیے، بال وال گندھوانے بیٹھوں تو دس یہیں بج جائیں گے''

پریم وتی: ''اچھا تو جاؤ مگر شام تک لوٹ آنا، گاڑی تیار کرا لو، میری طرف سے سباما کو پالاگن کہہ دینا'' برجن لپکی ہوئی کمرہ میں آئی۔ کپڑے بدلے، مادھوری کو باہر دوڑایا کہ گاڑی تیار کرنے کے لیے کہہ آ، تب تک کچھ خیال آیا، ردھیا سے پوچھا ''کچھ چٹھی پتر نہیں دیا؟''

ردھیا نے پرزہ نکال کر دے دیا۔ برجن نے اسے بڑے شوق سے لیا۔ مگر اسے پڑھتے ہی اس کا چہرہ کملا گیا۔ سوچنے لگی وہ دروازہ تک آ کر کیوں لوٹ گئے؟ اور خط بھی لکھا تو ایسا اکھڑا مہمل، چہ خوش! ہم سے عجلت کے باعث نہ مل سکے۔ ایسی کیا عجلت تھی، کیا گاڑی کے نوکر تھے۔ دن بھر میں کچھ نہیں تو پانچ چھ گاڑیاں جاتی ہوں گی۔ کیا مجھ سے ملنے کے لیے ان سے دو گھنٹہ کی دیر بھی برداشت نہ ہو سکی۔ ضرور اس میں کچھ نہ کچھ راز ہے۔ مجھ سے کونسی خطا ہوئی۔ یکایک اسے اس وقت کی یاد آئی جب وہ عالم بے قراری میں پرتاپ کے پاس گئی تھی۔ اور اس کی زبان سے نکلا تھا'' للو! مجھ سے کیسے صبر ہوگا؟'' برجن کو اب سے پہلے کئی بار خیال آ چکا تھا کہ میرا اس وقت کا اور اس حالت میں جانا بہت ہی نامناسب تھا۔ اس وقت یقین ہو گیا کہ میں ضرور للو کی نگاہوں میں گر گئی۔ میری محبت اور عزت اب ان کے دل میں نہیں ہے۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بیٹھ گئی۔ اور مادھوی سے بولی'' کوچبان سے کہہ دے

گاڑی تیار نہ کرے میں نہ جاؤں گی‘‘

## 15

## محبت اور فرض کی کشمکش

جس وقت برج رانی سسرال نہ آئی تھی۔ اس کی نگاہوں میں ایک ہندو پتی برتا عورت کے فرائض اور ذمہ داریوں کا کوئی اعلیٰ معیار قائم نہ ہوا تھا۔ گھر میں کبھی اس کے شوہر کا ذکر نہ آتا۔ اگر آتا تو کسی نا خوشگوار طریقے پر۔ اس نے استری دھرم کی کتابیں بھی پڑھی تھیں مگر ان کا کوئی دیرپا اور متحرک اثر اس پر نہ ہوا تھا۔ غالباً اسے یہ خیال ہی نہ آتا تھا کہ یہ گھر میرا نہیں ہے اور مجھے بہت جلد یہاں سے جانا پڑے گا

مگر جب وہ سسرال میں آئی اور اپنے دل و جان کے مالک، اپنے آقا، اپنے شوہر کو ہر دم آنکھوں کے سامنے دیکھنے لگی تو رفتہ رفتہ اس کے دل کی کیفیت متغیر ہونا شروع ہوئی۔ روشن ہوا کہ میں کون ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرا کیا دھرم ہے اور مجھے کس طرح اپنا دھرم نباہنا چاہیے۔ اگلی باتیں خواب سی معلوم ہونے لگیں۔ ہاں جس وقت یاد آجاتی کہ کم از کم ایک خطا مجھ سے ایسی ہوئی ہے جس کی تلافی میں نہیں کر سکتی تو وہ خود بخود شرم سے سر جھکا لیتی اور اپنے تئیں کوستی۔ اسے تعجب ہوتا کہ للو کے سامنے جانے کی مجھے کیوں کر جرأت ہوئی۔ شاید اس واقعہ کو خواب سمجھنے کی کوشش کرتی۔ تب للو کی شریفانہ صورت اس کے پیش نظر ہو جاتی اور وہ صدق دل سے اسے دعا دیتی۔ روز بروز اس کی محبت اور عظمت دل میں زیادہ ہوتی جاتی تھی۔

لیکن جب آج پرتاپ چند کی تلون مزاجی سے اسے یہ خیال کرنے کا موقع ملا کہ للو اس واقعہ کو بھی بھولا نہیں ہے اور اس کی نگاہوں میں میری عزت وقعت نہیں رہی۔ یہاں تک کہ وہ میری صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہے تو اسے حسرت ناک غصہ پیدا ہوا۔ پرتاپ کی طرف سے طبیعت مکدر ہوگئی اور اس کی جو محبت اور عزت دل میں تھی وہ چشم زدن میں پانی کے آبی بخارات کی طرح غائب ہونے لگی۔ عورتیں

انتہائی درجہ کی ذکی الحس ہوتی ہیں وہ جتنی پر دلی اور یکسوئی سے محبت کرسکتی ہیں۔ جس پرتاپ کے لیے وہ اپنی ہستی خاک میں ملا دینے کو تیار تھی وہ اس کے ایک طفلانہ فعل کو بھی درگزر نہیں کرسکتا۔ کیا اس کا دل ایسا تنگ ہے۔ یہ خیال برجن کے دل ہی دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔

آج سے برجن کی وہ زندہ دلی رخصت ہوگئی۔ دل پر ایک بوجھ سا رہنے لگا۔ سوچتی کہ جب پرتاپ مجھے بھول گئے اور میری رتی بھر بھی عزت نہیں کرتے۔ تو اس صدمہ سے میں کیوں اپنی جان کھپاؤں۔ جیسے رام تلسی سے ویسے تلسی رام سے۔ اگر انہیں مجھ سے نفرت ہے۔ اگر وہ میری صورت سے بیزار ہیں تو میں بھی ان کی صورت سے متنفر ہوں اور مجھے بھی ان سے ملنے کی خواہش نہیں۔ تب وہ اپنے ہی اوپر جھنجھلا اٹھتی کہ میں ہر دم انہیں کی بات کیوں سوچا کرتی ہوں کہ اب ان کا خیال بھی دل میں نہ آنے دوں گی۔ مگر ذرا دیر میں خیال پھر اسی طرف جا پہنچتا اور وہی خیالات بے چین کرنے لگتے۔ قلبی اور خیالی انتقام کے جوش میں وہ کملا چرن سے خلوص و محبت کا اظہار کرنے لگی۔ وہ ذرا دیر کے لیے کہیں چلا جاتا تو اس سے شکایت کرتی۔ جتنے نقد روپے جمع کر رکھے تھے۔ وہ سب اسے دے دیئے کہ اپنے لیے سونے کی گھڑی اور طلائی چین خریدے۔ کملا نے ذرا انکار کیا تو آب دیدہ ہوگئی۔ وہ یوں ہی اس کا غلام بنا ہوا تھا۔ اب کی محبت کا یہ رنگ دیکھ کر اور بھی جان دینے لگا۔ دوستوں نے سنا تو مبارکبادیں دینے لگے۔ میاں حمید اور سعید اپنی اپنی قسمتوں کو کوسنے لگے کہ ایسی محبتی بیوی ہمیں نہ ملی۔ تمہیں وہ بنا مانگے یوں ہی سرفراز کرتی ہیں اور یہاں بیویوں کی فرمائشوں کے مارے ناک میں دم ہے۔ چاہے اپنے پاس کانی کوڑی نہ ہو مگر ان کی فرمائشیں ضرور پوری ہونی چاہئیں ورنہ طوفان نوح برپا ہو جائے گا۔ اجی اور کیا کہیں کبھی گھر میں ایک بیڑے پان کے لیے چلے جاتے ہیں تو وہ بھی بے دس پانچ الٹی سیدھی سنے بن نصیب نہیں ہوتا۔ خدا ہم کو بھی تمہاری سی بیوی

عطا کرے۔

یہ سب تھا کملاچرن بھی محبت کرتا تھا اور برج رانی بھی محبت کرتی تھی۔ مگر دونوں کے ملنے سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے، برجن کے چہرے پر اس کا مطلق نشان نہ تھا۔ روز بروز زرد اور نحیف ہوتی جاتی تھی۔ کملاچرن قسمیں دے کر پوچھتا کہ تم دبلی کیوں ہوئی جاتی ہو۔ اسے خوش رکھنے کی جو تدبیریں بن پڑتیں کرتا۔ یار دوستوں سے بھی اس اہم معاملہ میں مشورہ لیتا مگر کچھ کارگر نہ ہوتا تھا۔ برج رانی ہنس کر کہہ دیا کرتی کہ تم کچھ فکر نہ کرو۔ میں بالکل اچھی ہوں یہ کہتے کہتے اٹھ کر اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگتی یا پنکھا جھلنے لگتی۔ ان خاطرداریوں سے کملاچرن پر خموں کا سرور ہو جاتا۔ مگر لکڑی کے اوپر رنگ روغن لگانے سے وہ کیڑا نہیں مرتا جو اندر بیٹھا ہوا ہو۔ اس کا کلیجہ کھائے جاتا ہے۔ یہ خیال کرکے پرتاپ چند مجھے بھول گئے اور میں ان کی نظروں میں گر گئی ناسور کی طرح اس کے کلیجے میں چھید کیا کرتا تھا۔ اس کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ بستر پر سے اٹھنا مشکل ہو گیا۔ ڈاکٹروں کا علاج ہونے لگا۔

ادھر پرتاپ چند کی طبیعت الہ آباد میں سنبھل چلی تھی۔ ورزش کا تو اسے شوق تھا ہی، وہاں اس کا خوب چرچا تھا۔ غم غلط کرنے کا اچھا مشغلہ ہاتھ آیا۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے جسمانی ورزش سے بڑھ کر اور کوئی علاج نہیں ہے۔ صبح کو جمناسٹک اور کشتی۔ شام کو کرکٹ اور فٹ بال اور آٹھ نو بجے رات تک باغیچوں کی سیر۔ اتنی محنت کے بعد چارپائی پر گرتا تو سویرے آنکھ کھلتی چھ ہی مہینوں میں کرکٹ اور فٹ بال کا کپتان بن بیٹھا اور دو تین میچ ایسے معرکے کے کھیلے کے سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔

آج علی گڑھ کی ایک زبردست ٹیم سے ان کا کرکٹ میں مقابلہ تھا۔ یہ ٹیم ہندوستان کی مشہور ٹیموں کو شکست دیتی، فتح کا ڈنکا بجاتی ہوئی یہاں پہنچی تھی۔ انہیں

غالباً اپنی فتح کی جانب سے کوئی اندیشہ نہ تھا۔ وہ کئی مضبوط ٹیموں سے پالے مار چکا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی الہ آباد والے مایوس نہ نظر آتے تھے۔ ان کی امیدیں پرتاپ چند سے وابستہ تھیں۔ اگر وہ آدھ گھنٹہ بھی جم گیا، تو رنوں کے انبار لگا دے گا۔ اور اگر اتنی ہی دیر تک گیند چل گیا تو پھر ادھر کا وارا نیارا ہے۔ پرتاپ کو بھی اتنا بڑا میچ کھیلنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ کلیجہ بانسوں اچھل رہا تھا کہ جانے کیا نتیجہ ہو۔ دس بجے کھیل شروع ہوا۔ پہلے علی گڑھ کے کھیلنے والوں کی باری آئی اور دو ڈھائی گھنٹوں تک انہوں نے خوب جوہر دکھائے۔ ایک بجتے بجتے کھیل کا پہلا حصہ ختم ہوا۔ علی گڑھ نے 400 رن کیے۔ اب الہ آباد والوں کی باری آئی مگر کھلاڑیوں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ یقین ہو گیا کہ بے طرح ہار ہے۔ اب عہدہ برا ہونا محال ہے اتنے رن کون کرے گا؟ اکیلے پرتاپ کیا بنا لے گا پہلا کھلاڑی آیا اور تیسرے گیند میں رخصت، دوسرا آیا اور مشکل سے پانچ گیند کھیل سکا۔ تیسرا آیا اور پہلی ہی گیند میں کیچ ہو گیا۔ چوتھے نے آکر دو تین معرکے کے ہٹ لگائے مگر جم نہ سکا۔ پانچویں صاحب بلاک کرنے میں شہر کا کالج تھے۔ مگر یہاں ان کی بھی کچھ نہ چلی۔ تھاپی رکھتے ہی غائب ہو گئے۔ اب پرتاپ چند متانت سے قدم اٹھاتا، بیٹ گھماتا گھماتا میدان میں آیا۔ طرفین نے تالیاں بجائیں۔ الہ آبادیوں کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ ہر شخص کی آنکھیں پرتاپ چند کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ چوطرفہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کچھ لوگ دور بیٹھے ہوئے تھے خدا سے دعا کر رہے تھے کہ پرتاپ سرخرو لوٹے۔ دیوی اور دیوتا یاد کیے جا رہے تھے۔ پہلا گیند آیا پرتاپ نے خالی دیا۔ الہ آبادیوں کے دل انچ بھر بیٹھ گئے۔ دوسرا گیند آیا وہ بھی خالی دیا۔ الہ آبادیوں کے دل ناف تک پہنچ گئے بہت سے آدمی چھتری سنبھال کر گھر کی طرف چلے۔ تیسرا گیند آیا۔ ایک پتاخے کی آواز آئی اور گیند شہاب ثاقب کی طرف آسمان کو چیرتا ہوا ہٹ پر کھڑے ہونے والے فیلڈر سے سو گز کے فاصلہ پر گرا۔ الہ

آبادیوں نے تالیاں بجائیں۔ سوکھے دھان میں پانی پڑا۔ جانے والے ٹھٹک گئے مایوسیوں نے پیٹھ سیدھی کی۔ دوسرا گیند آیا پہلے والے گیند سے دس گز آگے گرا۔ فیلڈر چونکے۔ ہٹ پر کمک پہنچائی۔ پانچواں گیند آیا اور کٹ پر گیا۔ اتنے میں اوور ہوا۔ بولر بدلے، نئے بولر پورے قاتل تھے مہلک قاتل تھے مہلک گیند پھینکتے تھے مگر ان کے پہلے ہی گیند کو پرتاپ نے سورج سے بات کرنے کے لیے آسمان کی طرف بھیج دیا۔ پھر تو گیند اور تھاپی میں سازش ہوگئی۔ گیند آتا اور تھاپی سے بغلگیر ہوکر کبھی پورب کی راہ لیتا اور کبھی پچھم کی راہ لیتا۔ کبھی اتر کی اور کبھی دکن کی۔ فیلڈروں کا دوڑتے دوڑتے ناک میں دم تھا۔ الہ آباد والے اچھلتے تھے بغلیں بجاتے تھے۔ ٹوپیاں ہوا میں اچھل رہی تھیں۔ ایک صاحب نے روپے نکال کر لٹا دیئے۔ دوسرے صاحب نے اپنی زنجیر لٹادی۔ حریف دل میں جلتے جھنجھلاتے۔ کبھی میدان کی ترتیب بدلتے اور کبھی بالر تبدیل کرتے۔ مگر سب تدبیریں اور چالیں بے اثر ہو رہی تھیں۔ گیند کا تھاپی سے یارانہ ہوگیا تھا۔

کامل دو گھنٹوں تک پرتاپ پٹاخے اور بم گولے اور ہوائیاں چھوڑتا رہا اور فیلڈر گیند کی طرف لپکتے جیسے بچے چاند کی طرف لپکتے ہیں۔ رنوں کی تعداد تین سو تک پہنچ گئی۔ حریفوں کے چھکے چھوٹے۔ ایسے حواس باختہ ہو رہے تھے کہ ایک گیند بھی سیدھا نہ آرہا تھا۔ فیلڈ میں بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ پرتاپ نے پچاس رن اور کیے اور اب اس نے امپائر سے ذرا دم لینے کی مہلت مانگی۔ اسے آتے دیکھ کر ہزاروں آدمی اس کی طرف لپکے اور اسے باری باری سے گود میں اٹھالیا چاروں طرف بھگدڑ مچ گئی۔ سینکڑوں چھاتے، چھڑیاں، ٹوپیاں اور جوتے عالم بالا کی سیر کرنے لگے۔ گویا وہ بھی فرط مسرت سے اچھلے پڑتے تھے۔ عین اسی وقت تار گھر کے چپراسی نے تار کا لفافہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پڑھتے ہی پرتاپ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ٹھنڈی سانس لے کر کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا "یارو اب میچ کا فیصلہ تمہارے

ہاتھ ہے میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔اسی گاڑی سے واپس مکان چلا جاؤں گا‘‘

یہ کہہ کر وہ بورڈنگ ہاؤس کی طرف چلا۔سینکڑوں آدمی پوچھنے لگے۔کیا ہے، کیا ہے، لوگوں کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔مگر اسے بات کرنے کی فرصت کہاں، اسی وقت ٹرین پر بیٹھا اور بنارس کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے بھر ان کا دل تشویش کا جولان گاہ بنا رہا۔بار بار اپنے کو نفرین کرتا کہ میں چلتے وقت کیوں نہ اس سے مل سکا۔اب نہ جانے اس سے ملاقات ہو نہ ہو۔اگر خدانخواستہ اس کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی تو میں بھی منہ میں کالک لگا کر کہیں مر رہوں گا۔یہی باتیں سوچ کر کئی بار رویا نو بجے شب کو گاڑی بنارس پہنچی۔اس پر سے اترتے ہی سیدھا شیاما چرن کے مکان کی طرف چلا۔فرط ملال سے آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ڈپٹی صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور کملا ڈاکٹر صاحب کے یہاں جانے کو تیار کھڑا تھا۔پرتاپ چند کو دیکھتے ہی دوڑ کر لپٹ گیا۔شیاما چرن نے بھی گلے لگایا اور بولے

’’کیا ابھی سیدھے الہ آباد سے چلے آ رہے ہو؟‘‘

پرتاپ:’’جی ہاں! آج اماں کا تار پہنچا کہ برجن کی حالت بہت خراب ہے کیا ابھی وہی حالت ہے؟‘‘

شیاما چرن’’کیا کہوں ادھر دو تین مہینے سے روز بروز کمزوری ہوتی جاتی ہے۔ڈاکٹر صاحب تو کہتے ہیں تپ دق ہے مگر حکیم صاحب ضعف جگر بتلاتے ہیں دواؤں کا مطلق اثر نہیں ہوتا، دیکھیں ایشور کو کیا منظور ہے؟‘‘

برجن کو جب سے خبر ملی کہ پرتاپ چند آئے ہیں، تب سے اس کے دل میں امید اور بیم کی گھڑ دوڑ مچی ہوئی تھی۔کبھی سوچتی کہ گھر آئے ہوں گے۔تو چچی نے زبردستی ٹھیل ٹھال کر یہاں بھیج دیا ہو گا۔پھر خیال ہوا کہ شاید میری بیماری کی خبر پائی ہو۔گھبرا کر ملنے آئے ہو۔مگر نہیں انہیں میری ایسی کیا فکر پڑی ہے۔سوچا ہو گا کہ کہیں

مرنہ جائے لاؤ چلو دنیا کا برتاؤ تو کرتا آؤں۔ انہیں میرے مرنے جینے کا کیا غم، آج میں بھی حضرت سے جی کھول کر باتیں کروں گی۔ لیکن نہیں باتوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انہوں نے چپ سادھی ہے تو میں کیوں بولوں۔ بس اتنا کہہ دوں گی کہ بہت اچھی طرح ہوں اور تمہاری خیریت کی دعا کرتی رہتی ہوں۔ پھر زبان نہ کھولوں گی اور میں یہ میلی کچیلی ساڑھی پہنے کیوں بیٹھی ہوں۔ جو اپنا ہمدرد نہ ہو اس کے آگے یہ صورت رہنے سے فائدہ۔ وہ مہمان کی طرح آئے ہیں۔ میں بھی مہمان کی طرح ان سے پیش آؤں گی۔ انسان کا دل کیسا پیچیدہ ہے جس شخص کی سرد مہری کے خیال نے برجن کی یہ گت بنا رکھی تھی اسی شخص کے جلانے کے ایسے ایسے منصوبے باندھ رہی ہے۔

دس بجے کا وقت تھا۔ مادھوری بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ دواؤں کی شیشیاں ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں اور برجن چارپائی پر پڑی یہی سب باتیں سوچ رہی تھی کہ پرتاپ کمرہ میں داخل ہوا مادھوری چونک کر بولی ''بہن اٹھو آ گئے'' برجن ہکا بکا ہو کر اٹھی اور چارپائی سے اترنا چاہتی تھی کہ ضعف کے مارے زمین پر گر پڑی۔ پرتاپ نے اسے سنبھالا اور چارپائی پر لٹا دیا۔ آہ! یہ وہی برجن ہے جو آج سے چند ماہ قبل حسن اور شباب کی مورت تھی۔ جس کے مکھڑے پر چمک اور ہنسی کا بسیرا تھا۔ جس کا بولنا شیاما کا گانا اور ہنسنا من کا لبھانا تھا۔ وہی رسیلی آنکھوں والی، میٹھی باتوں والی برجن اب ایک تودہ استخواں ہو گئی ہے۔ پہچانی نہیں جاتی تھی۔ پرتاپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مزاج کی کیفیت پوچھنا چاہتا تھا مگر منہ سے صرف اتنا نکلا'' برجن'' اور آنکھوں سے اشک کے قطرے ٹپکنے لگے۔

محبت کی آنکھیں جذبات کے پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ برجن نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور ان چند قطرہ ہائے اشک نے اس کے دل کا سب غبار دھو دیا۔

جیسے کسی فوج کا سپہ سالار جو آنے والی لڑائی کا نقشہ دل میں سوچ رہا ہو غنیم کو اپنی

پشت پر دیکھ کر بد حواس ہو جاتا ہے اور مجوزہ نقشہ کا خیال بھی اسے نہیں رہتا، اسی طرح برجن پرتاپ چند کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ سب باتیں بھول گئی جو وہ ابھی پڑی سوچ رہی تھی۔ وہ پرتاپ کو روتے دیکھ کر اپنا سب دکھ بھول گئی اور چارپائی سے اٹھ کر اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ پرتاپ چند جسے خطاوار کہہ سکتے ہیں اس وقت مظلوم کی حیثیت میں تھا۔ اور برجن جس نے اپنے تئیں گھلا گھلا کر اس حالت کو پہنچا دیا تھا، رو رو کر اس سے کہہ رہی تھی، للو چپ رہو، ایشور جانتا ہے میں بالکل اچھی ہوں۔ گویا اچھا نہ ہونا، اس کی خطا تھی، عورتوں کے احساسات کیسے نازک ہوتے ہیں۔ پرتاپ کی ایک ذرا سی سہل انگاری نے برجن کو اس کی زندگی سے لاپرواہ بنا دیا تھا۔ اور آج آنسوؤں کی چند بوندوں نے اس کے دل کی وہ جلن، وہ سوز، وہ آگ بجھا دی جو کئی مہینوں سے اس کے خون اور جگر کو جلا رہی تھی۔

جو مرض بڑے بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں کے علاج سے دور نہ ہوا اسے آنسوؤں کے چند قطروں نے چشم زدن میں دور کر دیا۔ کیا یہ پانی کے قطرے امرت کی بوندیں تھیں؟

پرتاپ نے ضبط کر کے پوچھا ’’برجن! تم نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے‘‘

برجن (مسکرا کر) ’’یہ گت میں نے نہیں تم نے بنائی ہے‘‘

پرتاپ: ’’اماں کا تار نہ پہنچتا تو مجھے اطلاع بھی نہیں ہوتی‘‘

برجن: ’’ضرورت کیا تھی جسے بھلانے کے لیے الہ آباد چلے گئے۔ اس کے مرنے جینے کی تمہیں کیا پرواہ؟‘‘

پرتاپ: ’’باتیں بنا رہی ہو، غیروں کو کیوں خط لکھتیں؟‘‘

برجن: ’’کسے امید تھی کہ تم اتنی دور سے آنے کی یا خط لکھنے کی زحمت اٹھاؤ گے جو دروازے سے آ کر پھر جائے اور صورت دیکھنے تک کا روادار نہ ہو اسے خط بھیج کر کیا کرتی؟‘‘

پرتاپ ''اس وقت لوٹ جانے کا جتنا صدمہ مجھے ہوا تھا میرا دل ہی جانتا ہے۔ تم نے اس وقت تک میرے پاس کوئی خط نہ لکھا تھا۔ میں نے سمجھا کہ اب یاد دل سے جاتی رہی''

برجن: ''اگر میں تمہاری باتوں پر اعتبار کرنے کی عادی نہ ہوتی تو اس وقت کہہ دیتی کہ یہ سوچی ہوئی باتیں ہیں''

پرتاپ: ''خیر جیسا سمجھو، اب یہ بتاؤ کہ طبیعت کیسی ہے؟ میں نے تمہیں پہچانا نہیں کیسا چہرہ اتر گیا ہے؟''

برجن: ''اب اچھی ہو جاؤں گی دوا مل گئی''

پرتاپ کنایہ سمجھ گیا افسوس! میری ذرا سی غلطی نے یہ قیامت ڈھا دی۔ دیر تک اسے سمجھاتا رہا اور علی الصبح جب وہ اپنے گھر چلا تو برجن کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسے بھولے نہیں ہیں اور میری یاد اور عزت ان کے دل میں قائم ہے۔ پرتاپ نے اس کے جگر میں سے وہ کانٹا نکال دیا جو کئی مہینوں سے کھٹک رہا تھا اور جس نے اس کی یہ حالت کر دی تھی۔ ایک ہی ہفتہ میں اس کا مکھڑا کندن کی طرف دمکنے لگا گویا کبھی بیمار ہی نہ ہوئی تھی۔

## 16

## فرض کی جیت اور محبت کی ہار

مریض جب تک بیمار رہتا ہے، اسے خبر نہیں ہوتی کہ کون میری تیمار داری کرتا ہے۔ کون میری عیادت کے لیے آتا ہے۔ وہ اپنی ہی تکلیفوں میں اس قدر محو رہتا ہے کہ کسی بات کا خیال ہی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ مگر جب اسے صحت ہو جاتی ہے تو اپنے تیمارداروں کی توجہ اور پریشانی سرگرمی اور جانفشانی کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ اور اس کے دل میں ان کی محبت اور عزت زیادہ ہو جاتی ہے بعینہ یہی حال برج رانی کا تھا۔ جب تک وہ خود آزار دل میں مبتلا تھی، کملاچرن کی حیرانیوں اور

پریشانیوں کا اندازہ نہ لگا سکتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اس کی خاطر داری میں کوئی بات اٹھا نہ رکھتی مگر یہ خاطر داریاں محض ایک فرضی انتقام کے خیال سے ہوتی تھیں نہ کہ سچی محبت سے لیکن جب اس کے جگر سے غم کا کانٹا نکل گیا تو کملا کی دواد ش اور سرگردانیاں یاد آئیں اور یہ فکر پیدا ہوئی کہ ان عنایات بیکراں کا جواب کیوں کر دوں میرا دھرم تھا کہ اپنی ذات سے انہیں آرام پہنچاتی۔ مگر آرام کا تو کیا ذکر میں تو الٹا ان کی جان کی گاہک ہوئی ہوں۔ وہ تو ایسے سچے دل سے میری محبت کریں اور میں اپنے فرائض بھی ادا نہ کرسکوں۔ ایشور کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ سچی محبت کا کمل بسا اوقات احسان کے اثر سے کھل جایا کرتا ہے۔ جہاں حسن و شباب، دولت و جاہ اور محاسن ذاتی محبت کا بیج بونے میں ناکام رہتے ہیں وہاں اکثر احسان کا جادو چل جاتا ہے۔ کوئی دل ایسا سخت اور سرد نہیں ہوسکتا جو سچی خدمت کے احسان سے پگھل نہ جائے

کملا اور برج رانی میں روز بروز اخلاص اور پیار بڑھنے لگا۔ ایک بندہ محبت تھا تو دوسری کنیز فرض۔ ممکن نہ تھا کہ برج رانی کی زبان سے کوئی بات نکلے اور کملا چرن اس کے پورا کرنے کے لیے دل و جان سے کوشش نہ کرے۔ اب اس کی محنت اور لیاقت انہیں کوششوں میں صرف ہوتی تھی۔ پڑھنا صرف والدین کو دھوکہ دینے کا ایک وسیلہ تھا۔ وہ ہمیشہ اس کی طبیعت کا رنگ پرکھتا رہتا اور اس امید پر کہ یہ کام ان کی خوشی کا باعث ہوگا۔ وہ سب کچھ کرنے کا تیار تھا۔ ایک روز اس نے مادھوری کو پھلواڑی سے پھول چنتے دیکھا۔ یہ چھوٹا سا باغیچہ مکان کی پشت پر تھا۔ مگر چونکہ کنبہ کے کسی فرد کو اس سے دلی ہمدردی نہ تھی اس لیے بارہوں مہینے اس پر خزاں کا دور رہتا تھا۔ برج رانی کو پھولوں سے فطری محبت تھی پھلواڑی کی یہ درگت دیکھی تو مادھوری کو تاکید کی کبھی کبھی اس میں پانی دے دیا کرو۔ رفتہ رفتہ باغیچے کی حالت کچھ کچھ سنبھل چلی اور بعض پودوں میں پھول نظر آنے لگے۔ کملا چرن کے لیے اتنا اشارہ کافی

تھا۔دل وجان سے باغیچہ کے سنوارنے پر تل گیا۔دو ہوشیار مالی نوکر رکھ لیے۔قسم قسم کے خوش رنگ پھول اور پودے لگائے جانے لگے۔انواع واقسام کی گھانسیں اور پتیریاں گملوں میں سجائی جانے لگیں۔چمن اور روشیں درست ہونے لگیں۔جا بجا لتائیں چڑھادی گئیں۔کملاچرن دن کے دن کتاب ہاتھ میں لیے باغیچہ میں ٹہلتا پھرتا اور مالیوں سے باغیچہ کی بناوٹ اور سجاوٹ کی تاکید کرتا رہتا تھا۔صرف اس لیے کہ برجن خوش ہوگی۔ایسے بندہ رضا کا جادو کس پر نہ چل جائے گاایک دن کملا نے کہا آؤتمہیں باغیچہ کی سیر کراؤں۔برج رانی تیار ہوگئی۔چاند نکل آیا تھااوراس کی زرد روشنی میں پھول اور پودے بہت سہانے معلوم ہوتے تھے۔دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی اور موتیے اور بیلے کی لپٹیں دماغ کو معطر کیے دیتی تھیں۔ایسے وقت میں برجن ایک ملگجی ریشمی ساڑھی اور ایک نفیس مخملی سلیپر پہنے روشوں پر ٹہلتی نظر آتی۔اس کے چہرے کی ملاحت پھولوں کو شرمندہ کررہی تھی۔معلوم ہوتا تھا کہ پھولوں کی دیوی ہے۔کملاچرن بولے ''آج محنت سپھل ہوگئی''

جیسے قمقموں میں گلاب بھرا ہوتا ہے، اسی طرح برج رانی کی آنکھوں میں محبت کا رس بھرا ہوا تھا۔وہ مسکرائی مگر زبان سے کچھ نہ بولی

کملا ''مجھ جیسا خوش نصیب آدمی دنیا میں نہ ہوگا''

برجن: ''کیا مجھ سے بھی زیادہ؟''

کملا متوالا ہو رہا تھا برجن کو پیار سے گلے لگالیا

کچھ دنوں تک روزانہ یہی معمول رہا۔اسی اثناء میں تازہ دلچسپیوں کے سامان پیدا ہوگئے۔رادھاچرن نے تصویروں کا ایک خوبصورت البم برجن کے پاس بھیجا۔اس میں کئی تصویریں چندرا کی بھی تھیں۔کہیں وہ شیاما کو بیٹھی پڑھا رہی ہے۔کہیں بیٹھی ہوئی خط لکھ رہی تھی۔اس کی تصویر مردانہ لباس میں تھی۔رادھاچرن فوٹوگرافی کے فن سے بھی واقف تھا۔برجن نے یہ البم بہت پسند کیا۔پھر کیا تھا کملا کو دھن سوار ہوئی کہ

میں بھی تصویر کشی میں مہارت حاصل کروں گا اور برجن کی تصویر کھینچوں گا۔ بھائی کے پاس لکھ بھیجا کہ کیمرہ اور دوسرے سامان ضروری میرے پاس بھیج دیجیے۔ اور مشق شروع کر دی۔ گھر سے چلتے کہ مدرسہ جا رہا ہوں اور بیچ میں ایک فوٹو گرافر کی دکان پر آ بیٹھتے۔ تین چار مہینے کی محنت اور کوشش میں اس فن سے پوری واقفیت ہو گئی۔ مگر ابھی تک گھر پر کسی کو یہ راز معلوم نہ تھا۔ کئی بار برجن نے پوچھا بھی مگر کملا چرن نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔

ایک روز کملا چرن کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ برجن کے جی میں آئی لاؤ پرتاپ چند کو ایک خط لکھ ڈالوں۔ مگر صندوق کھولا تو چٹھی کا کاغذ ندارد۔ مادھوری سے کہا جا کر اپنے بھیا کی ڈیسک سے تھوڑا سا کاغذ نکال لا۔ مادھوی روڑی ہوئی گئی تو اسے ڈیسک پر تصویروں کا البم کھلا ہوا ملا۔ اس نے البم اٹھا لیا اور اندر آ کر بولی "بہن دیکھو یہ تصویر ملی۔"

برجن نے اسے شوق سے ہاتھ میں لے لیا اور پہلا ہی ورق الٹا تھا کہ اچنبھا سا ہو گیا۔ وہ اسی کی تصویر تھی۔ وہ اپنی پلنگ پر چادر اوڑھے نیند میں مست پڑی تھی، بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور ایک ایک عضو سے بے تکلفی ٹپکتی تھی۔ ہونٹوں پر ایک دل پذیر مسکراہٹ کا جلوہ تھا، گویا کوئی دل پسند خواب دیکھ رہی ہے۔ تصویر کے نیچے جلی حروف میں لکھا تھا "خواب ناز" برجن حیرت میں تھی کہ میری ایسی تصویر انہوں نے کیسے کھنچوائی۔ کیا کسی فوٹو گرافر کو اندر لائے ہوں گے؟ نہیں ایسی شرارت بھلا کیا کریں گے۔ کیا تعجب ہے خود ہی سیکھ لیا ہو۔ ادھر مہینوں سے بہت مشغول بھی تو ہیں۔ اگر خود ایسی عمدہ تصویر کھینچی ہے تو واقعی قابل تعریف کام کیا ہے۔ دوسرا ورق الٹا تو وہ بھی اپنی ہی تصویر۔ وہ ایک ساڑھی پہنے بے تکلفی سے آدھے سر تک آنچل ڈالے سیر چمن میں مصروف تھی۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا "سیر باغ" تیسرا ورق الٹا تو وہ بھی اپنی تصویر تھی۔ وہ باغیچہ میں زمین پر بیٹھی ہار گوندھ رہی تھی۔ ڈھیروں

پھول ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں اور مادھوری دوڑ دوڑ کر پھول چن رہی ہے۔ یہ تصویر تینوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ کیونکہ مصور نے بڑی صفائی سے قدرتی رنگ بھرے تھے۔ اس تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ ''البیلی مالن'' اب برجن کو خیال آیا کہ ایک روز جب میں ہار گوندر رہی تھی تو کملا چرن نیل کانٹے کی جھاڑی سے مسکراتے ہوئے نکلے تھے۔ ضروری اسی دن یہ تصویر کھینچی ہو گی۔ چوتھا ورق الٹا تو ایک نہایت لطیف اور دلکش منظر دکھائی دیا۔ ایک شفاف پانی کا چشمہ تھا اور اس کے دونوں کناروں پر جہاں تک نگاہ پہنچتی تھی گلاب کے تختے نظر آتے تھے۔ ان کے نازک پھول ہوا کے جھونکے سے لچکے ہوئے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قدرت نے سبز آسمان میں سرخ تارے ٹانک دیئے ہیں۔ یہ کسی انگریزی تصویر کی نقل معلوم ہوتی ہے۔ البم کے اور صفحے ابھی سادہ تھے۔

برجن نے اپنی تصویریں دوبارہ دیکھیں اور اس نخوت آمیز مسرت کے ساتھ جو ہر پری پیکر کو اپنے حسن پر ہوتی ہے، البم کو چھپا کر رکھ دیا۔ شام کو کملا چرن نے آ کر دیکھا تو تصویریں غائب تھیں۔ ہوش اڑ گئے، وہ اس کے کئی مہینوں کی جگر کاوی کا ثمرہ تھیں اور اسے امید تھی کہ البم تحفہ میں دے کر برجن کے دیدۂ دل میں اور بھی گھر کرلوں گا۔ بہت پریشان ہوا، اندر جا کر برجن سے دریافت کیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ بے چارہ گھبرایا ہوا اپنے دوستوں کے گھر گیا کہ شاید ان میں سے کوئی اٹھا لے گیا ہو۔ مگر وہاں بھی بجز پھبتیوں کے کچھ ہاتھ نہ لگا۔ آخر جب حضرت بہت زچ ہو گئے تو شام کے وقت برجن نے البم کا پتہ بتایا۔

اسی طرح دن لطف سے گزر رہے تھے۔ آپس میں چھیڑ چھاڑ اور مزے کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ دونوں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ میدان الفت میں آگے نکل جائیں مگر دونوں کی محبتوں میں فرق تھا۔ کملا چرن غلبہ الفت میں اپنے کو بالکل بھول گیا تھا۔ برعکس اس کے برجن کی محبت فرض کی بنیاد پر قائم تھی۔ ہاں یہ خوش گوار فرض

تھا جسے محبت کی چاشنی نے بہت پرلذت بنا دیا تھا۔

تین سال اور گزر گئے۔ یہ ان کی زندگی کے تین مبارک سال تھے۔ چوتھے سال کا آغاز ایام مصیبت کی ابتدا تھا۔ بعض ہستیوں کو قدرت کی جانب سے دنیا کی نعمتیں اور کامرانیاں اس بہتات سے ملتی ہیں کہ ان کے لیے دن سدا ہولی اور رات سدا دیوالی رہتی ہے۔ مگر کتنی ہی ایسی بدقسمت ہستیاں بھی ہیں جس کا پیانہ محبت چھوٹا اور چھچھلا ہوتا ہے۔ ایسا چھوٹا کہ آنکھوں میں نشہ کی سرخی آنے سے پہلے ہی جام خالی ہو جاتا ہے اور مسرت کے چند لمحے زندگی کی سیاہ گھٹا میں ایک بار بجلی کی طرح کوند کر ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ جاتے ہیں۔ برج رانی انہیں بدقسمتوں میں تھی۔

بسنت کی رت تھی۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ سردی اس غضب کی تھی کہ کنوئں کا پانی جم جاتا تھا۔ اس وقت شہر میں طاعون کا دورہ ہوا۔ ہزاروں آدمی اس کی نذر ہو گئے۔ ایک روز شدت کا بخار آیا۔ ایک گلٹی نکلی اور مریض راہی ملک عدم ہو گیا۔ گلٹی کا نکلنا گویا موت کا پروانہ تھا۔ کیا حکیم کیا ڈاکٹر کسی کا علاج کارگر نہیں ہوتا۔ سینکڑوں گھر بے چراغ ہو گئے۔ ہزاروں بچے یتیم ہو گئے اور ہزاروں عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ جس کے جدھر سینگ سمائے ادھر بھاگ نکلا۔ ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ کوئی کسی کا ہمدرد اور غم خوار نہیں تھا۔ والدین بچوں کو چھوڑ بھاگے۔ عورتیں مردوں سے کنارہ کش ہو گئیں۔ گلیوں میں، سڑکوں پر، مکانوں میں جدھر دیکھیے لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ دکانیں بند ہو گئیں، دروازوں میں قفل پڑ گئے۔ چوطرفہ خاک اڑتی تھی۔ مشکل سے کوئی جان دار چلتا پھرتا دکھائی دیتا تھا۔ اور اگر کوئی مجبور ہو کر گھر سے نکل پڑا تو وہ ایسی تیزی سے قدم اٹھاتا تھا گویا موت کا سپاہی اس کے تعاقب میں ہے۔ ساری بستی ویران ہو گئی۔ اگر آباد تھا تو قبرستان یا شمشان، چوروں اور رہزنوں کی بن آئی، دن دہاڑے قفل ٹوٹتے تھے اور آفتاب کی روشنی میں سیندیں پڑتی تھیں۔ جو لوگ طاعون سے بچے انہیں فاقوں نے آ دبوچا۔ غرض عجیب مصیبت کا

سامنا تھا۔

بابو شیاما چرن بہت مضبوط دل کے آدمی تھے۔ مکان کے چاروں طرف محلے خالی ہو گئے تھے، مگر وہ ابھی تک اپنے مکان میں بے خوف وخطر تھے۔ مگر جب ان کا ایک سائیس مر گیا تو سارے کنبے میں کھلبلی مچ گئی اور دیہات چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ منشی جی نے اسی ضلع میں چند گاؤں خرید لیے تھے اور مجگاؤں نامی موضع میں ایک وسیع مکان بنوا رکھا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ پنشن پانے پر یہیں بود وباش اختیار کروں گا۔ کاشی چھوڑ کر آگرے میں کون مرنے جائے۔ برجن نے یہ تجویز سنی تو بہت خوش ہوئی۔ دیہاتی زندگی کے روشن پہلو اس کی آنکھوں میں پھر رہے تھے۔ ہرے بھرے درخت اور سبز لہلہاتے ہوئے کھیت، ہرنوں کے جھنڈ اور چڑیوں کا چہچہانا، یہ بہاریاں لوٹنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ کملا چرن بھی شکار کے لیے اپنی بندوق صاف کرنے لگے۔ مگر منشی جی نے اسے بلا کر کہا کہ تم الہ آباد جانے کے لیے تیار ہو جاؤ! پرتاپ چند وہاں تمہارا نگراں رہے گا۔ دیہات میں وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل؟ اتنا سننا تھا کہ کملا چرن کی نانی مر گئی۔ الہ آباد جانے سے صاف صاف انکار کر بیٹھا۔ بہت دیر تک منشی جی اسے سمجھاتے رہے مگر وہ جانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ آخر ان آخری الفاظ نے فیصلہ کر دیا ''تمہارے مقسوم میں علم لکھا ہی نہیں ہے، میری حماقت ہے کہ اس سے لڑتا ہوں''

برج رانی نے جب یہ تازہ تجویز سنی تو اسے بہت رنج ہوا۔ عورت کے مزاج میں خود بینی کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بوا زعفران کے بھی دل میں اپنی خوبصورتی کی تعریف سن کر گدگدی پیدا ہونے لگتی ہے۔ برج رانی اب بھی سمجھتی تھی کہ کملا کا دھیان پڑھنے میں نہیں لگتا۔ مگر یہ تغافل اب اسے ناگوار معلوم نہ ہوتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات اس کا جی چاہتا تھا کہ آج یہ مدرسے نہ جاتے تو اچھا ہوتا۔ کملا کی محبت آمیز آواز اس کے کانوں کو بہت پیاری معلوم ہوتی۔ مگر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ کملا نے الہ آباد

جانے سے صاف انکار کر دیا اور لالہ جی بہت سمجھا رہے ہیں تو اسے کچھ دنوں تک تنہا رہنا گوارا تھا۔ بجائے اس کے کہ کملا کو اپنے والد کی نافرمانی کرتے دیکھے۔ مادھوری کو بھیجا کہ اپنے بھیا کو بلا لا! مگر کملا نے جگہ سے ہلنے کی قسم کھالی تھی۔ سوچتا کہ اندر جاؤں گا تو وہ ضرور الہ آباد جانے کے لیے کہے گی۔ اسے کیا خبر کہ یہاں دل پر کیا گزر رہی ہے۔ کاش! اس کا دل مجھے مل جاتا، یوں بات چیت میں تو قند و شکر گھول دیتی ہے۔ مگر جب کبھی محبت کے امتحان کا موقع آ جاتا ہے تو فرض اور مصلحت کے پردے میں منہ چھپانے لگتی ہے۔ حق یہ ہے کہ عورتوں میں وفا کی بو ہی نہیں ہوتی۔

جب رات زیادہ ہوگئی اور کملا جگہ سے نہ ہلا تو برج رانی خود آئی اور بولی "کیا آج گھر میں جانے کی قسم کھالی ہے۔ راستہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں"

کملا: "اندر جاتے ڈر معلوم ہوتا ہے"

برجن: "اچھا چلو میں ساتھ چلتی ہوں، اب تو نہ ڈرو گے"

کملا: "مجھے الہ آباد جانے کے لیے حکم ہوا ہے"

برجن: "میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی"

یہ کہہ کر برجن نے کملا کی طرف آنکھیں اٹھائیں۔ ان میں انگور کے خوشے لگے ہوئے تھے۔ کملا ہار گیا، ان موہنی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا جگر تھا جو اپنی ضد پر قائم رہے۔ کملا نے اسے گلے لگالیا اور بولے

"میں جانتا تھا کہ تم جیت جاؤ گی اسی لیے اندر نہ جاتا تھا"

ساری رات محبت کی الوداعی باتیں ہوتی رہیں۔ محبت کی باتیں ہوتی رہیں گویا وہ کبھی نہ ملیں گی۔ افسوس! یہ جدائی آخری ملاقات تھی۔ برجن نے پھر کملا کی صورت نہ دیکھی۔ وہ کیا جانتی تھی کہ قسمت ہمیں ہمیشہ کے لیے جدا کر رہی ہے۔

## 17

## برجن کے خطوط کملا کے نام

# 1

پیارے: محبت نامہ ملا، سر اور آنکھوں سے لگایا۔ ایسے خط تم نہ لکھا کرو، کلیجہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ میں لکھوں تو مضائقہ نہیں۔ یہاں طبیعت سخت گھبرا رہی ہے۔ کیا سنتی تھی اور کیا دیکھتی ہوں، ٹوٹے پھوٹے پھوس کے جھونپڑے۔ ایک ایک بالشت کی بوسیدہ دیواریں۔ گھر کے سامنے کوڑے کرکٹ کے بڑے بڑے ڈھیر، کیچڑ میں لپٹی ہوئی سوریں، دبلی مریل گائیں، یہ سب نظارہ دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ کہیں چلی جاؤں۔ آدمیوں کو دیکھو تو خستہ حال، ہڈیاں نکلی ہوئیں، پریشانی کی مورت، افلاس کی زندہ تصویریں، کسی کے جسم پر ثابت کپڑا نہیں، کیسے قسمت کے کھوٹے کہ رات دن پسینہ بہانے پر بھی کبھی پیٹ بھر روٹیاں نصیب نہ ہوں۔ خیر ہمارے مکان کے پیچھے ایک چھوٹی سی گڑھیا ہے۔ مادھوری کھیلتی تھی۔ پیر پھسلا تو پانی میں گر پڑی۔ یہاں مشہور ہے کہ اس گڑھیا میں چڑیلیں نہایا کرتی ہیں۔ اور خواہ مخواہ راہ چلتوں کو چھیڑتی ہیں۔ اسی طرح دروازہ پر پیپل کا ایک تناور درخت ہے۔ وہ بھوتوں کا کمبخت پیپل کے بھوتوں کا خوف تمہارے گاؤں کے دلوں پر ایسا چھایا ہوا ہے کہ سر شام ہی راستہ بند ہو جاتا ہے۔ لڑکے اور عورتیں ادھر قدم ہی نہیں رکھتیں۔ ہاں اکا دکا مرد کبھی کبھی گزر بھی جاتا ہے مگر وہ بھی گھبرایا ہوا۔ یہ دو مقام تو گویا ان پلید روحوں کے مرکز ہیں۔ ان کے علاوہ صدہا بھوت چڑیل مختلف مقامات میں پائے جاتے ہیں۔ معتبر روایتیں ہیں کہ چڑیلیں نظر آتی ہیں۔ گاؤں والوں نے ان کے مزاج پہچان رکھے ہیں۔ کسی بھوت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ سر چڑھتا ہے تو مہینوں پیچھا نہیں چھوڑتا اور کوئی دو ایک دن میں پوجا لے کر الگ ہو جاتا ہے۔ گاؤں والوں میں ان امور پر اس طرح کی باتیں ہوتی ہیں گویا یہ بدیہی واقعات ہیں۔ یہاں تک سنا گیا ہے کہ چڑیلیں کھانا مانگنے اور پانی لینے آیا کرتی ہیں ان کی ساڑھیاں عموماً بگلے کے پر کی طرح صاف ہوتی ہیں اور باتیں کس قدر ناک میں کرتی ہیں۔ ہاں گہنے کا استعمال

ان کی قوم میں رائج نہیں۔ ان کی زد میں آجانے کا خطرہ ان جوان عورتوں کو ہوتا ہے جو بناؤ سنگھار کیے، رنگین کپڑے پہنے اکیلی نظر آجاتی ہیں۔ پھولوں کی باس ان کو بہت پسند ہے۔ مجال نہیں کہ کوئی عورت یا لڑکا دوپہر کو یا رات کو اپنے دوبارہ کہیں پاس پھول رکھ کر سوئے۔

بھوتوں کے رتبہ کا امتیاز دانائی سے کیا گیا ہے۔ جوگی بابا آدھی رات کو کالی کمریا اوڑھے کھڑاؤں پر سوار چاروں طرف گھومتے ہیں اور بھولے بھٹکے مسافروں کو راستہ بتاتے ہیں۔ سال بھر میں ایک سا ان کی پوجا ہوتی ہے۔ وہ اب بجائے بھوتوں کے دیوتاؤں کے زمرہ میں شامل ہوتے ہیں وہ کسی آفت کو حتی الوسع گاؤں میں قدم نہیں رکھنے دیتے۔ اس کے برعکس دھوبی بابا سے بچہ بچہ تھراتا ہے۔ جس درخت پر ان کی بودوباش ہے ادھر سے اگر کوئی چراغ جلنے کے بعد گزر جائے تو اس کی جان کی خیر نہیں۔ انہیں بھگانے کو دو بوتل شراب کافی ہے۔ ان کا پجاری منگل کے دن اس درخت کے تلے گانجہ اور چرس رکھ آتا ہے۔ ایک لالہ صاحب بھی بھوت بن بیٹھے ہیں۔ یہ ذات شریف پٹواری تھے۔ انہیں چند ستم زدہ آسامیوں نے قتل کر ڈالا۔ ان کی پکڑ وہ بلا کی پکڑ ہے کہ جان لیے پیچھا نہیں چھوڑتی۔ کوئی پٹواری یہاں سال بھر سے زیادہ نہیں رہ سکتا تھا۔ تم کہو گے کہ یہ کہاں سے بھوت چڑیل کا پچڑا لے بیٹھی۔ میں کیا کروں گاؤں سے ذرا فاصلہ پر ایک درخت ہے، اس پر مولوی صاحب قیام فرماتے ہیں۔ وہ بے چارے کسی کو نہیں چھیڑتے۔ ہاں جمعرات کے روز جمعراتی نہ پہنچ جائے تو بچوں کو ستاتے ہیں۔

کیسی جہالت ہے! کیسی توہم پرستی! یہ خیالات ان لوگوں کا خمیر ہو گئے ہیں۔ بچہ بیمار ہوا اور بھوت کی پوجا ہونے لگی۔ کھیت کھلیان میں بھوت کا حصہ، بیاہ شادی میں بھوت کا حصہ، جدھر دیکھیے بھوت ہی بھوت نظر آتے ہیں یہاں نہ دیوی ہیں نہ دیوتا۔ بھوتوں کا راج ہے، جمراج یہاں قدم نہیں رکھتے۔ روحیں بھوت ہی قبض

کرتے ہیں ۔ان خیالات کی کیوں کر اصلاح ہو گی ۔اور کیا لکھوں ۔

تمہاری

برجن



## 2

### مجگاؤں

پیارے! شکر ہے بعد مدت کے تمہارا پریم پتر ملا۔ کیا سچ مچ خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں، خط کیا لکھا ہے گویا بیگار ٹالی ہے۔ تم میں تو یہ عادت نہ تھی، کیا وہاں جا کر کچھ اور ہو گئے۔ تمہیں یہاں سے گئے دو ماہ ہو گئے۔ اس درمیان میں کئی چھوٹی بڑی تعطیلیں پڑیں مگر تم نہ آئے۔ تم سے ہاتھ جوڑ کے کہتی ہوں۔ ہولی کی تعطیل میں ضرور آنا۔ اگر اب کی تر سایا تو مجھے ہمیشہ شکایت رہے گی۔

یہاں آ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی دوسری دنیا میں آ گئی ہوں۔ رات کی سوئی ہوئی تھی کہ یکا یک ہاہا ہو کا غل سنائی دیا۔ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ لڑکے گھر گھر سے لکڑی اور اپلے وصول کرتے پھرتے ہیں۔ ہولی ماتا کی یہی خوراک ہے۔ یہ طوفان بدتمیزی جہاں پہنچ گیا، ایندھن کا ستھراو ہو گیا، کسی کی مجال نہیں کہ اس طوفان فوج کو روک سکے۔ ایک نمبر دار کی منڈیا غائب ہو گئی۔ اس میں دس بارہ بیل آسانی سے بندھ سکتے تھے۔ ہولی والے کئی دن سے تاک میں تھے۔ موقع پا کر اڑا کر لے گئے۔ ایک کرمی کا جھونپڑا اڑ گیا۔ کتنے ہی ایلو رلا پتہ ہو گئے۔ لوگ اپنی لکڑیاں گھروں میں بھرے لیتے ہیں۔ لالہ جی نے ایک پیڑ ایندھن کے لیے مول لیا تھا۔ آج رات کو وہ بھی ہولی ماتا کے منہ میں چلا گیا۔ دو تین گھروں کے کواڑ اڑ گئے۔ پٹواری صاحب دروازہ پر سو رہے تھے۔ انہیں زمین پر ڈھکیل کر لوگ چارپائی لے بھاگے۔ چوطرفہ ایندھن کی لوٹ مچی ہوئی ہے۔ جو چیز ایک بار ہولی ماتا کے منہ میں چلی گئی اسے پھیرلانا بڑا بھاری گناہ ہے۔ پٹواری صاحب نے بڑی دھمکیاں دیں کہ میں جمع بندی بگاڑ دوں گا۔ خسرہ بگاڑ دوں گا، مگر کچھ نہ ہوا۔ یہاں کا رسم ہے کہ ان دنوں ہولی والے دن جو چیز پائیں بلا مزاحمت لے جائیں۔ کون کس کی فریاد کرے۔ نوجوان بیٹا اپنے باپ کی آنکھ بچا کر اپنی ہی چیز اٹھوا دیتا ہے۔ اگر وہ

ایسا نہ کرے تو اپنی جماعت میں ذلیل سمجھا جاتا ہے۔

فصل تیار ہوگئی ہے مگر کاٹنے میں دو ہفتہ کی کسر ہے۔ میرے دروازے پر سے میلوں کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ گیہوں اور جو کے سنہرے کھیتوں کے کنارے کنارے کسم کے سرخ اور زعفرانی پھولوں کا حاشیہ نہایت خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ چو طرفہ طوطے منڈلایا کرتے ہیں۔ مادھوری نے یہاں کئی سکھیاں بنا رکھی ہیں۔ پڑوس میں ایک اہیر رہتا ہے۔ رادھا نام ہے۔ پارسال ماں باپ طاعون کا شکار ہو گئے تھے۔ گرہستی کے کل کار اسی کے سر پر ہیں۔ اس کی بیوی تلسی ہمارے یہاں اکثر آتی ہے۔ خوبصورت نک سک سے درست ہے۔ بات چیت کرنے میں شرمائی جاتی ہے۔ بھولی اتنی کہ جی چاہتا ہے گھنٹوں اس کی باتیں سنا کروں۔ مادھوری نے اس سے بہناپا کر رکھا ہے۔ کل ان کی گڑیوں کا بیاہ ہے۔ تلسی کی گڑیا اور مادھوری کا گڈا ہے سنتی ہوں بے چاری بہت غریب ہے۔ مگر میں نے اس کے چہرے پر کبھی میل نہیں دیکھی کہتی تھی کہ اپلے بیچ کر دو روپیہ جمع کر لیا ہے۔ ایک روپیہ جہیز میں دے گی اور ایک روپیہ میں براتیوں کا کھانا پینا ہوگا۔ گڑیا کہ گہنے کپڑے کا بوجھ رادھا کے سر ہے۔ کیسی سادہ قناعت سے بھری ہوئی معاشرت ہے۔

لو اب رخصت ہوتی ہوں۔ تمہارا وقت بکواس سننے میں ضائع ہوا معاف کرنا، تمہیں خط لکھتی ہوں تو قلم رکتا ہی نہیں، ابھی بہتیری باتیں لکھنے کو پڑی ہیں، پرتاپ چند کو میرا پالاگن کہہ دینا۔

تمہاری

برجن

3

## مجگاؤں

پیارے! محبت نامہ ملا، سینے سے لگایا، خوب! چوری اور سینہ زوری، اپنے نہ آنے کا الزام میرے سر رکھتے ہو۔ میرے دل سے کوئی پوچھے کہ اسے تمہارے دیدار کی کتنی آرزو ہے۔ اب یہ تمنا اضطراب کی صورت پکڑتی جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو بے چین ہو جاتی ہوں۔ میری یہ حالت تھوڑے ہی دنوں سے ہونے لگی ہے۔ جس وقت یہاں سے گئے، مجھے معلوم نہ تھا وہاں جا کر میری ذلیل کرو گے۔ خیر تمہیں سچ اور میں ہی جھوٹ، مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے میرے خط پسند کیے۔ مگر پرتاپ چند کو نا حق دکھائے۔ وہ حالات قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ غلطیاں رہ گئی ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ پرتاپ نے انہیں بہت قیمتی سمجھا ہو۔ اگر وہ میرے خطوط کی اتنی وقعت سمجھتے ہیں کہ ان کے سہارے سے ہماری دیہاتی معاشرت پر کوئی دلچسپ مضمون لکھ سکیں تو میں اپنے تئیں بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں۔

کل یہاں دیوی جی کی پوجا تھی۔ ہل، چکی، پر اور چولہے سب بند تھے۔ دیوی جی کا ایسا ہی حکم ہے۔ اب ان کے حکم کی نافرمانی کون کرے۔ حقہ پانی بند ہو جائے۔ سال بھر میں یہی ایک دن ہے جسے گاؤں والے بھی تعطیل سمجھتے ہیں۔ ورنہ ہولی دیوالی بھی روزمرہ کے ضروری کام نہیں بند کر سکتیں۔ بکرا چڑھا، ہون ہوا، ستو کھلایا گیا۔ اب گاؤں کے بچے بچے کو یقین کامل ہے کہ طاعون کا دور یہاں نہ ہو سکے گا۔ یہ سب تماشہ دیکھ کر سوئی تھی۔ قریب بارہ بجے ہوں گے کہ سینکڑوں آدمی ہاتھوں میں مشعلیں لیے غل مچاتے نکلے اور سارے گاؤں کا پھیرا کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ بیماری اس حد کے اندر قائم نہ رہ سکے گی۔ طواف کے ختم ہونے پر چند آدمی دوسرے گاؤں کی حدود میں گھس گئے اور تھوڑا سا پان چاول لونگ وغیرہ چیزیں زمین پر رکھ دیں۔ یعنی اپنے گاؤں کی بلا دوسرے گاؤں والوں میں ڈال دی۔ جب

یہ لوگ اپنا کام پورا کر کے چلنے لگے، تو اس گاؤں والوں کو سن گن مل گئی۔ سینکڑوں آدمی لاٹھی لے کر چڑھ دوڑے۔ اور دونوں گاؤں میں خوب مار پیٹ ہوئی۔ اس وقت گاؤں کی حدود میں کئی آدمی ہلدی پی رہے ہیں۔

آج سویرے کل کے بچے کھچے رسوم ادا کیے گئے جسے یہاں کی اصطلاح میں کڑھائی دینا کہتے ہیں۔ میرے دروازے پر ایک بھٹہ کھودا گیا اور اس میں ایک گڑھا دودھ سے لبریز رکھا گیا کاشی نام کا ایک بھر ہے جو وہ بدن پر بھبھوت رمائے آیا۔ گاؤں کے آدمی ٹاٹ پر بیٹھے۔ کڑھاؤ کے مال کو بکھیر دیا گیا۔ جب کڑھاؤ میں خوب ابال آیا تو کاشی یکا یک اٹھا اور جے کالی جی کی کہہ کڑھاؤ میں کود پڑا۔ میں تو سمجھی اب یہ زندہ نہ نکلے گا مگر پانچ منٹ کے بعد کاشی نے پھر جست ماری اور کڑاہ کے باہر تھا۔ اس کا بال بھی بیکا نہ ہوا تھا۔ لوگوں نے اسے مالا پہنائی اور ہاتھ جوڑ کر پوچھنے لگے۔

"مہاراج! اب کی فصل کیسی ہوگی۔ پانی کیسا برسے گا، بیماری آئے گی یا نہیں۔ گاؤں کے لوگ خیریت سے رہیں گے؟ گڑھا بھاؤ کیسا رہے گا؟ کاشی نے ان سب سوالوں کے جواب صاف مگر مجذوبانہ الفاظ میں دیئے۔ اس کے بعد مجلس برخاست ہوئی۔ سنتی ہوں یہ جلسے ہر سال ہوا کرتے ہیں۔ کاشی کی سب پیشن گوئیاں سچی ثابت ہوتی ہیں اور کبھی ایک غلط ہو جائے تو کاشی ان کی تاویل بڑی خوبی سے کر دیتا ہے۔ کاشی کو ضمیر شناسی میں بڑا ملکہ ہے۔ گاؤں میں کہیں چوری ہو کاشی اس کا پورا پتہ دے گا جو کام پولیس کے بھیدیوں سے پورا نہ ہو وہ پورا کر دیتا ہے اور وہ گو ذات کا بھر ہے مگر گاؤں میں اس کی بڑی عزت تھی۔ ان سب خدمات کا معاوضہ وہ بجز شراب کے اور کچھ نہیں لیتا۔ نام نکلوائیے مگر ایک بوتل اس کی نذر کیجئے۔ آپ کا مقدمہ کچہری میں ہے۔ کاشی اس کی فتح کی کوشش میں سرگرم ہے بس اسے ایک بوتل آب سرخ دیجیے"

ہولی کا زمانہ بہت قریب ہے ایک ہفتہ سے زائد نہیں۔ اہا، میرا دل اس وقت کیسا باغ باغ ہو رہا ہے۔ دل میں مسرت آمیز گدگدی محسوس ہو رہی ہے۔ آنکھیں تمہیں دیکھنے کے لیے ترس رہی ہیں۔ یہ ہفتہ بڑی مشکلوں سے کٹے گا اور پیا کے درشن پاؤں گی

تمہاری پیاری

برجن



## مجگاؤں

پیارے! تم ظالم ہو، سنگدل ہو، بیوفا ہو، بے رحم ہو، بے درد ہو، جھوٹے ہو اور میں تمھیں کیا گالیاں دوں۔ اور کیا کوسوں، کاش تم اس وقت میرے سامنے ہوتے تو اس سنگدلی کا جواب دیتی۔ میں کہہ رہی ہوں، تم دغا باز ہو، میرا کیا کر لو گے، نہیں آتے ہو مت آؤ، رلانا منظور ہو تو رلاؤ مگر میں روؤں کیوں، میری بلا روئے، جب آپ کو اتنا خیال نہیں کہ دو گھنٹہ کا سفر ہے ذرا اس کی خبر لیتا آؤں؟ تو مجھے کیا غرض ہے کہ روؤں اور جان کھوؤں۔

ایسا غصہ آ رہا ہے کہ خط چاک کر کے رکھ دوں اور پھر تم سے بات نہ کروں۔ ہائے! تم نے میرے ارمان کیسے خاک میں ملا دیئے۔ ہولی، ہولی! اس ایک لفظ میں میرے لیے جادو بھرا تھا۔ کسی کی زبان سے نکلا اور میرے دل نے گدگدانا شروع کر دیا۔ مگر افسوس! ہولی گزر گئی اور میں ناکام اور نامراد رہ گئی۔ پہلے یہ لفظ سن کر دل میں گدگدی ہوتی تھی اب کلیجہ مسوستا ہے۔ اپنی اپنی قسمت ہے، گاؤں کے بھوکے ننگے لنگوٹی میں بھاگ کھیلیں، خوشیاں منائی جائیں۔ رنگ اڑائیں اور میں بیوگنی اپنی چارپائی پر سفید ساڑھی پہنے پڑی ہوں، قسم لے لو جو اس پر ایک سرخ دھبہ بھی پڑا ہو۔ قسم لے لو جو میں نے عبیر یا گلال ہاتھ سے چھوا ہو۔ میری عطر سے بسی ہوئی عبیر، کیوڑے میں گھلی ہوئی گلال، تکلیف سے بنائے ہوئے پان سب تمہاری سرد بے مہری کا رونا رو رہے ہیں۔ مادھوی نے جب بہت ہٹ کی تو میں نے ایک سرخ ٹیکہ لگوا لیا مگر آج ان شکایتوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اگر پھر کوئی کلمہ شکایت زبان سے نکلے تو زبان کاٹ لینا۔

پرسوں سرِ شام ہی گاؤں میں چہل پہل مچنے لگی۔ نوجوانوں کی ایک جماعت ہاتھ میں دف لیے مغلظات بکتی دروازے دروازے پھیرے لگانے لگی۔ مجھے نہ معلوم تھا

کہ آج یہاں اتنی گالیاں کھانی پڑیں گی۔ شرمناک الفاظ ان کے منہ سے ایسے نکلتے تھے جیسے پھول جھڑتے ہوں۔ شرم و لحاظ کا نام نہ تھا۔ باپ بیٹے پر، بیٹا باپ کے سامنے گالیاں بک رہا تھا۔ باپ للکار کر بہو سے کہتا ہے "آج ہولی ہے" بہو گھر میں سر نیچا کیے سنتی ہے اور مسکرا دیتی ہے۔ ہمارے پٹواری صاحب تو ایک ہی حضرت نکلے۔ آپ شراب میں مخمور نغمہ میں چور ایک میلی سی ٹوپی سر پر رکھے اس جماعت کے پیش رو تھے۔ ان کی بہو بیٹیاں بھی ان کے مغلظات کی طغیانی سے بچ نہ سکیں۔ گالیاں کھاؤ اور ہنسو۔ اگر چہرے پر ذرا بھی ملال آئے تو لوگ سمجھیں گے اس کی محرم کی پیدائش ہے خوب رواج ہے۔

تین بجے شب کے قریب یہ جماعت ہولی ماتا کے پاس پہنچی۔ لڑکے آتشبازیاں چھوڑ رہے تھے۔ میں بھی کئی عورتوں کے ساتھ گئی۔ وہاں عورتیں ایک طرف ہولیاں گا رہی تھیں۔ آخر میں ہولی میں آگ لگنے کا وقت آیا۔ آگ لگتے ہی دم کی دم میں شعلے بلند ہوئے اور سارا آسمان سنہرے رنگ میں رنگ گیا۔

دور دور کے پیڑ پتے منور ہو گئے۔ اب اس آتش کدہ کے چاروں طرف لوگ ہولی ماتا کی جے جے چلا کر دوڑنے لگے۔ سبھوں کے ہاتھوں میں گیہوں اور جو کی بالیاں تھیں جو وہ اس الاؤ میں پھینکتے جاتے تھے۔ جب شعلے بہت بلند ہو گئے تو لوگ ایک کنارے کھڑے ہو کر پھر کبیر کہنے لگے۔ ایک گھنٹہ تک یہی کیفیت رہی۔ لکڑی کے کندوں سے چٹاخ چٹاخ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ مویشی اپنے اپنے کھونٹوں پر مارے ڈر کے چیخ رہے تھے۔ تلسا نے مجھ سے کہا "اب کی ہولی کی لو ٹیڑھی جا رہی ہے۔ کشل نہیں جب لو سیدھی اٹھتی ہے تو گاؤں میں سال بھر خوشی کا دور دورہ رہتا ہے۔ لیکن لو کا ٹیڑھا ہونا منحوس ہے آخر شعلے تھمنے لگے۔ آنچ کی تیزی کم ہوئی۔ تب کچھ لوگ الاؤ کے نزدیک آ کر غور سے دیکھنے لگے جیسے کوئی چیز تلاش کر رہے ہوں۔ تلسا نے بتلایا کہ جب بسنت کے دن ہولی کی بنیاد پڑتی ہے تو پہلے ایک ارنڈ گاڑ

دیتے ہیں۔ اسی پر اپلے اور لکڑی کا ڈھیر لگایا جاتا ہے۔ اس وقت یہ لوگ اسی ارنڈ کے پودے کی تلاش کرر ہے ہیں۔ اس شخص کا بہادروں میں شمار ہوتا ہے جو سب سے پہلے اس پودے پر ایسا نشانہ لگائے کہ وہ ٹوٹ کر دور جا گرے۔ پہلے پٹواری صاحب پینترا بدل کر آئے مگر دس گز کی دوری سے جھانک کر چلے گئے۔ تب رادھا ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سونٹا لے کر دلیرانہ مستقل مزاجی سے آگے بڑھا اور آگ میں گھس گیا اور بھرپور وار کیا کہ پودا الگ جا گرا۔ لوگ ان ٹکڑوں کو لوٹنے لگے۔ ماتھے پر اس کا ٹیکہ لگایا کرتے ہیں اور اسے متبرک سمجھتے ہیں"

یہاں سے فرصت پا کر یہ مردانہ جماعت دیوی جی کے استھان کی طرف بڑھی مگر یہ نہ سمجھنا کہ وہاں دیوی جی کا ادب کیا گیا ہوگا۔ آج وہ بھی گالیاں سننا پسند کرتی ہے۔ چھوٹے بڑے سب انہیں مغلظات سنا رہے تھے۔ چند دن پہلے انہیں دیوی جی کی پوجا ہوئی تھی۔ حق یہ ہے کہ دیہات میں اس وقت ایشور کو گالی دینا بھی معاف ہے۔ ماں بہن کا تو کہیں شمار ہی نہیں۔

سویرا ہوتے ہی لالہ جی نے مہراج سے کہا آج کوئی دو سیر بھنگ پسوالو۔ اس کی دو قسمیں الگ الگ بنوالو۔ نمکین اور شیریں مہراج نکلے اور کئی آدمیوں کو پکڑ لائے۔ بھنگ پیسی جانے لگی۔ بہت سے کلہڑ منگا کر صفائی سے رکھے گئے۔ دو مٹکوں میں دونوں قسموں کی بھنگ بنائی گئی۔ پھر کیا تھی۔ تین چار گھنٹہ تک شائقین کا تانتا لگا رہا۔ لوگ تعریفیں کرتے ہیں اور سر ہلا ہلا کر مہراج کی کارگزاریوں کی داد دیتے ہیں، جہاں کسی نے قدردانی کی اور مہراج نے دوسرا کلہڑ بھرا اور بولے یہ نمکین ہے اس کا بھی سواد چکھ لو۔ اجی پی بھی لو۔ کیا روج روج ہولی آئے گی کہ روج روج ہمارے ہاتھ کی بنی ہوئی بوٹی ملے گی۔ اس کے جواب میں کسان ایسی نگاہوں سے تاکتا گویا کسی نے اسے نعمت دے دی ہے اور ایک کے بدلے تین کلہڑ چٹ کر جاتا پٹواری کے داماد منشی جگدمبا پرشاد صاحب تشریف لائے ہیں۔ آپ کچہری میں عرائض

نویس ہیں۔ انہیں مہراج نے اس قدر پلا دی کہ آپے سے باہر ہو گئے اور ناچنے کودنے لگے۔ گاؤں کا گاؤں انہیں آماجگاہ ظرافت بنائے ہوئے تھا۔ ایک کسان آتا اور ان کی طرف مسکرا کر کہتا ہے۔ تم یہاں ٹھاڑھی ہو۔ گھر جا کے کھانا پکاؤ ہم آوت ہیں اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑتا ہے۔ کاشی پھر دوہرا نشہ جمائے۔ لٹھ کندھے پر رکھے ہوئے آتا ہے، اور حاضرین کی طرف نقلی غصہ سے دیکھ کر گرجتا ہے ''مہراج! یہ بات اچھی نہیں کہ تم ہمرے نئے بڑھیا سے مجالوٹت ہو'' یہ کہہ کر وہ منشی جی کو سینہ سے چمٹا لیتا ہے۔ منشی جی بیچارے مختصر آدمی ادھر ادھر پھڑ پھڑاتے ہیں۔ مگر نقارے کی آواز میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ کوئی ان کو چومتا ہے، کوئی گلے لگاتا ہے۔ دوپہر تک یہی چھیڑ چھاڑ ہوا کی۔ ان کی دل لگی ایسی بھدی اور غلیظ ہوتی ہے کہ کوئی بار میرا جی بد مزہ ہو گیا۔ دوپہر ہو گئی۔ لیکن تلسا ابھی تک بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کہا آج ہمارے یہاں تمہارا نیوتہ ہے، ہم تم ساتھ کھائیں گے۔ یہ سنتے ہی مہراجن دو تھالیوں میں کھانا پروس کر لائیں۔ تلسا اس وقت کھڑکی کی طرف منہ کیے کھڑی تھی۔ میں نے جو اس کا ہاتھ کھینچ کر دیکھا تو اسے اپنی پیاری پیاری آنکھوں سے موتی کے دانے بکھیرتے دیکھا۔ جب میں بضد ہوئی تو اس نے سر نیچا کر کے کہا ''بہن آج سویرے ان پر نشان پڑ گیا۔ نہیں معلوم ان پر کیا بیت رہی ہو گی'' یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

معلوم ہوا کہ رادھا کے باپ نے کچھ قرض لیا تھا وہ ابھی تک ادا نہ ہو سکا۔ مہاجن نے سمجھا اسے حوالات لے چلوں تو روپیہ وصول ہو جائے گا۔ رادھا کئی کا ٹا پھرتا تھا۔ آج حریفوں کو موقع مل گیا تھا اور وہ اپنا کام کر گئے، افسوس، مواخذہ بیس روپیہ سے زائد نہ تھا۔ پہلے مجھے معلوم ہوتا تو غریب پر برس کے برس دن یہ تکلیف اور مصیبت نہ آتی۔ میں نے چپکے سے مہاراج کو بلایا اور انہیں بیس روپے دے کر رادھا کو رہا کرانے کے لیے روانہ کر دیا۔

اس وقت میرے دروازے پر ٹاٹ بچھا دیا گیا تھا۔ لالہ جی بیچ قالین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کسان لوگ گھٹنے تک دھوتیاں باندھے ہوئے، کوئی کرتہ پہنے، کوئی ننگے بدن، کوئی ننگے سر، کوئی پگڑی باندھے، کوئی ننگے منہ پر عبیر ملے (جوان کی کالی صورت پر خاص کیفیت پیدا کر رہی تھی) آنے لگے۔

جو آتا لالہ جی کے پیروں پر تھوڑی سی عبیر رکھ دیتا۔ لالہ جی بھی اپنی طشتری میں سے ذرا سی عبیر نکال کر اس کے ماتھے پر لگا دیتے اور مسکرا کر کوئی دل لگی کی بات کہہ دیتے وہ نہال ہو جاتا۔ زمین دوز ہو کر سلام کرتا اور ایسا خوش خوش آ کر بیٹھ جاتا گویا اسے کوئی دولت ملی ہے۔ مجھے خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ لالہ جی ان اجڈ دیہاتیوں کے ساتھ بیٹھ کر ایسے مزے سے باتیں کر سکتے تھے۔ اسی اثناء میں کاشی پھر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پیالی تھی۔ اس میں عبیر لیے ہوئے تھا مگر اس نے اوروں کی طرح عبیر لالہ جی کے پیروں پر نہیں رکھی بلکہ بڑی دلیری سے مٹھی بھر لے کر ان کے چہرے پر اچھی طرح مل دی۔ میں تو ڈری کہیں لالہ جی بدمزہ نہ ہو جائیں مگر وہ بہت خوش ہوئے اور خود بھی بجائے ایک ٹیکہ لگانے کے دونوں ہاتھوں سے اس کے منہ پر عبیر ملی۔ بعد ازاں مسکرا کر کہا۔

”آج اپنے گھر میں کہہ دینا ہمارے لیے بچھاون تیار رہے گا“

کاشی نے اسی طرح مسکرا کر کہا ”سرکار ہم برس کے برس دن کہاں جائیں گے“

اس وقت کاشی کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ اپنی نگاہ میں اپنے تمام ساتھیوں کا راجہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھی بھی اس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ بے شک تو شیر ہے اور تو اس قابل ہے کہ ہمارا سردار بنے۔

اسی طرح ایک ایک کر کے دو ڈھائی سو آدمی جمع ہو گئے۔ یکایک انہوں نے کہا ”آج کہیں رادھا نظر نہیں آتا۔ کیا بات ہے کوئی اس کے گھر جا کر دیکھے تو“ منشی جگد مبا پرشاد اظہار لیاقت کا اچھا موقع دیکھ کر بول اٹھے

’’حضور وہ تو بعات قرضہ زیر دفعہ 13 نمبر الف ایکٹ (ج) گرفتار ہو گیا۔ رام دین پانڈے نے وارنٹ کا خرچہ داخل کر دیا تھا۔ حسن اتفاق سے رام دین پانڈے بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ لالہ نے ان کی طرف حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا‘‘

’’کیوں پانڈے جی! اس غریب کو حوالات میں بند کرانے سے تمہارا گھر بھر جائے گا۔ یہی انسانیت اور شرافت اب رہ گئی ہے، تمہیں ذرا بھی رحیم نہ آیا کہ ہولی کے دن اسے بیوی بچوں سے الگ کر دیا۔ میں تو یہ ایمان سے کہتا ہوں کہ اگر میں رادھا ہوتا تو جیل خانہ سے واپس آنے کے بعد میری پہلی کوشش ہوتی کہ جس نے مجھے یہ دن دکھایا ہے، اسے میں بھی کچھ دن ہلدی ملوا دوں۔ تمہیں شرم نہیں آئی کہ اتنے معتبر مہاجن ہو کر تم نے بیس روپے کے لیے ایک غریب آدمی کو یوں مصیبت میں ڈالا۔ ڈوب مرنا چاہیے، ایسا لالچ؟‘‘

لالہ جی کو واقعی غصہ آ گیا تھا۔ رام دین ایسا خفیف ہوا کہ سب سٹی پٹی بھول گیا۔ منہ سے بات نہ نکلی، چپکے سے کچہری کی طرف چلے گئے۔ سب کے سب کسان اس کی طرف غضبناک نگاہوں سے تاک رہے تھے۔ اگر لالہ جی کا خوف نہ ہوتا تو پانڈے جی کی ہڈی پسلی چور ہو جاتی۔

اس کے بعد لالہ جی گھر میں آئے اور اپنے کمرہ میں بیٹھ کر بنت عنب سے شوق کرنے لگے۔ باہر حاضرین محفل نے گانا شروع کیا۔ نشہ میں تو سب کے سب چور ہو رہے تھے۔ اس پر لالہ جی نے ان برادرانہ خاطر و مدارت نے ان کے دلوں کو اور بھی ابھار دیا تھا، خوب ہی جی توڑ کر گایا۔ ڈفلی تو ایسی زور سے بجتی تھی کہ اب پھٹی اور اب پھٹی۔ جگدمبا پرشاد نے دوہرا نشہ جما دیا تھا۔ کچھ تو ان کے دل میں خود بخود امنگ پیدا ہوئی، کچھ دوسروں نے اشتعال دیا۔ آپ بیچ مجلس میں کھڑے ہو کر ناچنے لگے۔ یقین مانو میں نے اچکن ٹوپی دھوتی اور مانچھوں والے آدمی کو ناچتے نہ

دیکھا تھا، آدھ گھنٹہ تک وہ بندروں کی طرح اچھلتے کودتے رہے، آخر نشہ نے انہیں زمین پر سلا دیا۔ ان کے بعد ایک اہیر اٹھا، ایک اہیرن بھی زنانہ جماعت سے نکلی، اور دونوں میدان میں جا کر ناچنے لگے۔ دونوں نوجوان تھے اور پرتیلے۔ ان کی طرف کمر اور پشت کی لچک واقعی حیرت انگیز تھی۔ دف تال دے رہا تھا، ان کے رمز و کنائے، عشوے غمزے، کمر کا لچکنا اور بوٹی بوٹی کا پھڑکنا، گردن کا موڑ دیکھ کر اور اعضاء کا پھڑکنا دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ بہت مشق اور محنت کا کام تھا مگر اکثر ادائیں اور کنائے بے حیائی اور بے شرمی کا پہلو لیے ہوئے تھی۔ تلسا بھی ناچتی ہے مگر رادھا کے سوائے اور کسی کے ساتھ نہیں اور چاہیے بھی یہی۔

ابھی یہاں ناچ ہو ہی رہا تھا کہ سامنے سے بہت سے آدمی لمبی لمبی لاٹھیاں کندھوں پر رکھے آتے دکھائی دیئے۔ ان کے ساتھ ایک ڈف بھی تھا اور کئی آدمی ہاتھوں میں جھانجھ اور مجیرے لیے ہوئے تھے۔ وہ گاتے بجاتے آئے اور ہمارے دروازے پر رکے۔ یکا یک تین چار آدمیوں نے مل کر ایسی آررررکبیر کا نعرہ لگایا کہ مکان ہل گیا۔ لالہ جی نکلے یہ لوگ اسی موضع کے تھے، جہاں نکاسی کے دن لاٹھیاں چلی تھیں۔ لالہ جی کو دیکھتے ہی کئی آدمیوں نے ان کے منہ پر عبیر ملی۔ لالہ جی نے جواب دیا۔ پھر لوگ فرش پر بیٹھے۔ الائچی اور پان سے خاطر کی گئی۔ اس گاؤں والوں نے بھی عبیریں ملیں۔ اور ملوائیں۔ جب یہ لوگ رخصت ہونے لگے تو یہ ہولی گائی۔

سدا آنند رہے اس دوارے
موہن کھیلیں ہولی

کتنا خوبصورت گیت ہے۔ مجھے تو اس میں جذبہ اور اثر کوٹ کوٹ کر بھرا معلوم ہوتا ہے۔ ہولی کی غرض و غایت کیسے معصوم سادے اور مختصر الفاظ میں بھرا ہے بیان کر دی گئی ہے۔ سدا آنند رہے اس دوارے۔ موہن کھیلیں ہولی۔

میں بار بار یہ پیارا گیت گاتی ہوں اور مزہ لیتی ہوں۔ ہولی کا تہوار آپس میں پیار اخلاص و محبت اور اتحاد بڑھانے کے لیے ہے۔ ممکن نہ تھا کہ وہی لوگ جن سے چند روز قبل ماتھا پھٹول کی نوبت آ چکی تھی اس گاؤں میں وہی لوگ یوں بے محابا چلے آتے ہیں۔ مگر ہولی کا دن تھا۔ آج کسی کو کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ آج امن کی بادشاہت ہے۔ آج خوشی کا دور ہے۔ آج کے دن اگر رنج تو پردیسی بالم کی ابلا اور روئے تو نوجوان بیوہ، ان کے سوا اور سب کے لیے خوشی کا صلائے عام ہے کہ خوب مزے کرو اور گلچھرے اڑاؤ

آنے جانے والوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ یکا یک لالہ جی کی متین آواز آرررر کبیر کہتی ہوئی سنائی دی مجھے حیرت ہوئی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو واقعی وہی کانوں پر ہاتھ دھرے آرررر کی ہانک لگا رہے تھے۔ کبیر یہ ہے!

ہولی کے دن آئے پیارے کہ گھر گھر ڈھنڈورا دیو پھرائے

جو، اب مدرا نہ پیے واکو ساتوں جنم نسائے

خوب، لالہ جی کی زبان سے اور یہ ہولی۔ شام کے وقت گاؤں کی سب عورتیں ہمارے یہاں ہولی کھیلنے آئیں۔ ہر ایک اپنے لوٹے میں گھولی ہوئی عبیر لیے ہوئی تھی۔ اماں نے انہیں بڑی عزت سے بٹھایا۔ رنگ کھیلا، پان تقسیم کیا، میں مارے خوف کے باہر نہ نکلی، اس طرح نجات ملی، اب مجھے خیال آیا کہ مادھوری دوپہر سے غائب ہے میں نے سوچا کہ گاؤں گاؤں میں ہولی کھیلنے گئی ہے۔ میں نے دیکھا مگر ان عورتوں کے ساتھ نہ تھی

تلسا ابھی چپ چاپ من مارے کھڑکی کی طرف منہ کیے بیٹھی تھی۔ چراغ میں بتی پڑ رہی تھی کہ وہ یکا یک اٹھی اور میرے پیروں پر گر کر رونے لگی۔ میں نے کھڑکی کی طرف جھانکا تو دیکھتی ہوں کہ آگے آگے مہاراج ان کے پیچھے رادھا اور سب سے پیچھے رام دین پانڈے چلے آ رہے ہیں۔ گاؤں کے بہت سے آدمی ان کے ساتھ

ہیں۔ رادھا کا چہرہ مرجھایا ہوا ہے۔ لالہ جی نے جوں ہی سنا کہ رادھا آ گیا۔ چٹ باہر نکل آئے اور بڑی محبت سے اسے گلے لگا لیا۔ جیسے کوئی اپنے بیٹے کو گلے لگاتا ہے۔ رادھا چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ تلسا سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ گاؤں کے بہت سے آدمی رو رہے تھے، نہایت دردناک سین تھا۔ رام دین پانڈے سر نیچا کیے ایسا کھڑا تھا جیسے گئو ہتیا کی ہو۔ میرے روپے مل گئے مگر نیت ہے اسے تلسا کے لیے ایک گائے لینے میں خرچ کر دوں۔

رادھا اور تلسا دونوں اپنے گھر آئے۔ مگر ذرا دیر میں تلسا مادھوری کا ہاتھ پکڑے ہنستی ہوئی میرے کمرے میں آئی اور بولی ''ان سے پوچھو یہ اب تک کہاں تھیں؟''

میں: ''کہاں تھیں تم؟ دوپہر سے غائب ہے''

مادھوری: ''یہیں تو تھی''

میں: ''یہاں کہاں تھیں میں نے دوپہر سے نہیں دیکھا۔ سچ سچ بتا دو، میں ناراض نہ ہوں گی''

تلسا: (ہنس کر) ''سوتی کاہے کو رہیں، جاگتی رہیں، کھانا پکاتی رہیں، چوکا برتن کرتی رہیں''

مادھوری: ''تلسا کے گھر چلی گئی تھی''

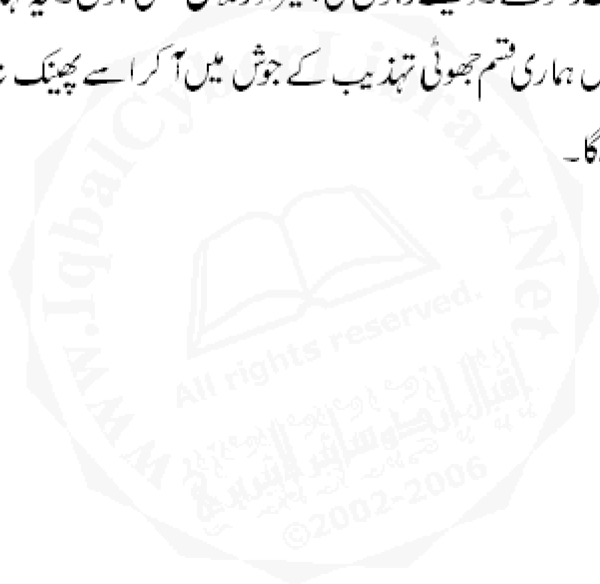
میں: ''تلسا تو یہاں بیٹھی ہے، وہاں اکیلے کیا سوتی رہیں؟''

مادھوری: ''ہاں چوکا برتن کرتی رہیں کوئی تمہارا نوکر لگا ہوا ہے''

معلوم ہوا کہ جب سے میں نے مہاراج کو رادھا کو چھڑانے کے لیے روانہ کیا تھا تب سے مادھوی تلسا کے گھر کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ اس کے کواڑ کھولے۔ یہاں سے آٹا لیا۔ گھر شکر سب کچھ لے گئی۔ آگ جلائی، اور پوریاں، کچوریاں، گلگلے، میٹھے سموسے سب بڑی نفاست سے بنائے۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ سب بنا کر چپکے سے چلی جاؤں گی۔ جب رادھا اور تلسا آئیں گے تو تعجب کریں گے کہ کون بنا

گیا مگر غالباً دیر ہو گئی اور مجرم پکڑا گیا۔ دیکھو کیسی نیک بخت لڑکی ہے۔

اتنی سمع خراشی کے بعد رخصت ہوتی ہوں، شکایتیں معاف کرنا، تمہاری چیری ہوں، جیسے رکھو گے۔ ویسے رہوں گی، عبیر اور گلال بھیجتی ہوں۔ یہ تمہاری کنیز کا تحفہ ہے۔ تمہیں ہماری قسم جھوٹی تہذیب کے جوش میں آ کر اسے پھینک نہ دینا ورنہ میرا دل دکھے گا۔




تمہاری

برج

# 5

## مجگاؤں

پیارے! تمہارے خط نے بہت رلایا، اب نہیں رہا جاتا، مجھے بلا لو، ایک نظر دیکھ کر چلی آؤں گی۔ سچ بتاؤ۔ اگر میں تمہارے یہاں آ جاؤں تو مسخرے پن کی تو نہ لو گے۔ نہیں معلوم دل میں کیا سمجھو گے مگر کیسے آؤں۔ تم لالہ جی کو لکھو، خوب! وہ کہیں گے یہ نئی دھن سمائی ہے۔ کل چارپائی پر پڑی تھی۔ سویرا ہو گیا تھا۔ خوب ٹھنڈی ٹھنڈی، دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی کہ عورتوں کے گانے کی آواز آئی عورتیں اناج کاٹنے جا رہی تھی۔ جھانک کر دیکھا تو دس بارہ عورتوں کی ایک جماعت تھی۔ سبھوں کے ہاتھوں میں ہنسیا، کندھے پر گٹھیا باندھے کی رسی اور سر پر بھنے ہوئے مٹر کی چھری تھی۔ یہ اس وقت جاتی ہیں۔ کہیں بارہ بجے لوٹیں گی۔ آپس میں گاتی چہلیں کرتی چلی جاتی تھیں اور گیت بھی کیسا سہانا تھا۔

مورے سیاں گھر آئے، رتیاں
چن چن کلیاں میں سیج بچھایوں
سیج نہ سوئے دھرے موری بہیاں
مورے سیاں گھر آئے، رتیاں

صبح کا وقت، مستانہ آوازیں، مسرت بھرے ہوئے دل، یہ گیت بہت مزیدار معلوم ہوتا تھا۔ ان کے سیاں گھر آئے، کیا میرے گھر میں بھی کبھی سیاں آئیں گے؟ دوپہر تک بڑی خیریت سے گزری۔ یکایک آسمان پر بادل چھا گیا، آندھی آ گئی اور اولے گرنے لگے۔ میں نے اتنے بڑے اولے گرتے نہ دیکھے تھے۔ آلو سے بڑے اور ایسی تیزی سے گرتے جیسے بندوق کی گولی۔ دم کی دم میں زمین پر ایک فٹ اولے کا اونچا سفید فرش بچھ گیا۔ چوفرطہ سے کسان بھاگنے لگے۔ گائیں بیل بکریاں سب چلاتی ہوئے پیڑوں کا سایہ ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ میں ڈوری کہ نہیں معلوم تلسا

پر کیا بیتی۔ نظر دوڑا کر دیکھا تو ایک کھلے میدان میں جو اناج کے کٹ جانے سے کفت دست ہو رہا تھا۔ **تلسا**، رادھا اور موہنی گائے نظر آئیں۔ تینوں گھمسان اولوں کی زد میں پڑے ہوئے تھے۔ **تلسا** کے گھر سر پر ایک چھوٹی سی ٹوکری نظر آئی اور رادھا کے سر پر ایک بڑا سا گٹھا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے کہ نہیں معلوم ان بیچاروں کا کیا حشر ہو گا۔ دفعتاً ایک سخت جھونکے نے رادھا کے سر سے گٹھا گرا دیا۔ گٹھے کا گرنا تھا کہ دم زدن میں **تلسا** نے اپنی ٹوکری اس کے اس پر اوندھا دی۔ نہیں معلوم اس پھول سے جسم پر کتنے اولے پڑے۔ اس کے ہاتھ کبھی پیٹھ پر جاتے کبھی سر سہلاتے۔ ایک سیکنڈ تک سے زیادہ یہ حالت رہی ہو گی کہ رادھا نے بجلی کی تیزی سے جھپٹ کر گٹھا اٹھا لیا اور ٹوکری **تلسا** کو دے دی۔ کیسی زبردست محبت ہے۔

ظالم آسمان نے سارے سامان بگاڑ دیئے سویرے عورتیں گاتے ہوئے جا رہی تھیں شام کو گھر گھر ماتم بپا تھا۔ کتنوں کے سر لہولہان ہو گئے۔ کتنے ہلدی پی رہے تھے۔ فصل ستیاناس ہو گئی۔ اناج برف کے تلے دب گیا۔ بخار کا زور ہے۔ سارا گاؤں اسپتال بنا ہوا ہے۔ کاشی بھر کی پیشن گوئی صادق آئی۔ ہولی کے شعلوں کا راز ظاہر ہو گیا۔ فصل کا یہ حال ہے اور مالگزاری وصول کی جا رہی ہے۔ بڑی بدعت ہو رہی ہے۔ مار دھاڑ، گالی گفتہ، غرض سبھی سے کام لیا جا رہا ہے، غریبوں پر یہ قہر خدا۔

تمہاری

برجن

## مجگاؤں

## میرے جان سے پیارے بالم!

پورے پندرہ دن کے بعد تم نے برجن کو یاد کیا۔خط کو بار بار پڑھا،چوما اور آنکھوں سے لگایا۔اور ایک ایک حرف کا مزہ لیا۔تمہارا خط بلا رلائے نہیں مانتا۔میں یوں بھی بہت رویا کرتی ہوں۔تم کو کن کن باتوں کی یاد دلاؤں۔میرا دل ایسا کمزور ہے کہ جب کبھی ان باتوں کی طرف خیال جاتا ہے تو عجیب بے چینی سی ہو جاتی ہے۔گرمی سی معلوم ہونے لگتی ہے اور ایک بڑا بے چین کرنے والا، بڑا با مزہ، بہت رلانے والا، بہت پر درد حسرت محسوس ہونے لگتا ہے۔جانتی ہوں کہ تم نہیں آرہے ہو۔اور نہ آؤ گے مگر بار بار دروازہ پر جا کر کھڑی ہو جاتی ہوں کہ تم آ تو نہیں گئے۔آج کل تمہارے لیے ایک بوٹے دار قمیض تیار کر رہی ہوں۔جی چاہتا ہے تم یہاں آتے، میں کہتی ذرا ٹھہرو۔دیکھو ٹھیک کٹی ہے یا نہیں،تب سلائی طے کرنے لگتی۔تم کچھ اور مانگتے میں کچھ اور مانگتی مگر لو،ایسی باتیں نہ کروں گی تمہارا ہرج ہو گا۔

کل شام کو یہاں ایک بڑا دلفریب تماشا دیکھنے میں آیا۔یہ دھوبیوں کا ناچ تھا۔پندرہ بیس آدمیوں کی ایک جماعت تھی۔ان میں نوجوان شخص سفید پشواز پہنے کمر میں بے شمار گھنٹیاں باندھے سر میں گھنگرو پہنے۔سر پر ایک لال ٹوپی رکھے ناچ رہا ہے۔جب یہ شخص ناچتا تو مردنگ بجنے لگتی ہے۔معلوم ہوا کہ یہ لوگ ہولی کا انعام مانگنے آئے ہیں۔یہ ذات بھی عجیب انعام لینے والی ذات ہے۔آپ کے یہاں کوئی کام کاج ہو تو انہیں انعام دیجیے اور ان کے یہاں کام کاج ہو تو بھی انعام دیجیے یہ لوگ ناچتے وقت گیت نہیں گاتے۔ان کا گانا ان کی شاعری ہے پشواز والا شخص ڈھول پر ہاتھ رکھ کر ایک برہا کہتا ہے،دوسرا آدمی سامنے آ کر اس برہے کا جواب دیتا ہے اور دونوں فی البدیہہ کہتے ہیں اس ذات میں شاعرانہ قابلیت بہت زیادہ ہے۔

ان برہوں کو غور سے سنو تو ان میں بعض بہت باریک شاعرانہ خیالات ادا کیے جاتے ہیں۔ پشواز والے شخص نے جو پہلا برہا کہا تھا اس کے یہ معنی تھے کہ اے دھوبی کے بچو! تم کس کے دروازے پر کھڑے ہو؟ دوسرے نے جواب دیا تھا اب نہ اکبر شاہ ہے نہ راجہ بھوج۔ اب جو ہیں ہمارے مالک ہیں انہی سے مانگو، تیسرے برہے کا مطلب تھا کہ منگتوں کی عزت کم ہو جاتی ہے۔ اس لیے تم لوگ کچھ سوال مت کرو۔ گا بجا کر چلے چلو۔ دینے والا بن مانگے ہی دے گا۔ گھنٹہ بھر یہ لوگ برہے کہتے رہے۔ تمہیں یقین نہ آئے گا۔ ان کے منہ سے برہے اس طرح بے تکلف نکلتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ شاید اتنی آسانی سے وہ بات چیت بھی نہ کر سکتے تھے۔ یہ ذات بڑی بلانوش ہے۔ اتنا درجہ کی پیکڑ شراب پانی کی طرح پیتے ہیں۔ بیاہ میں شراب، گونے میں شراب، پوجا پاٹ میں شراب، پنچایت میں شراب، انعام مانگیں گے تو پینے کے لیے، دھلائی مانگیں گے تو یہ کہہ کر آض پینے کو پیسہ نہیں ہے۔ رخصت ہوتے وقت ببچو دھوبی نے جو دعائیہ برہا کہا تھا وہ شاعرانہ استعارت سے بھرا ہے۔

"تمہارا پریوار اس طرح بڑھے جیسے گنگا کا پانی بڑھے اور پھلیں پھولیں جیسے آم کی بور مالکن کا سہاگ سدا بنا رہے۔ جیسے دوب کی ہریالی۔۔۔۔۔" کیسی نادر شاعری ہے

زیادہ بجز اشتیاق دیدار کے اور کیا لکھوں؟

تمہاری

برجن

## مجگاؤں

پیارے! ایک ہفتہ تک خاموش رہنے کی معافی چاہتی ہوں خوب! آپ کو شکوہ شکایت کا کیسا نادر موقع ہاتھ آیا ہے۔ واہ رے ہٹ دھرمی، مجھ پر یہ الزام کہ ہفتوں سدھ نہیں لیتی ہو۔ بجا فرماتے ہو میرے خط گن کر دیکھو تو ابھی کچھ نہ تو نصف درجن چٹھیوں کے دیندار ہو گے، مجھے اس ہفتہ میں بالکل فرصت نہیں ملی۔ مادھوری بیمار ہو گئی تھی۔ پہلے تو کونین کی تین چار پڑیاں کھلائی گئیں۔ مگر جب اس سے افاقہ نہ ہوا اور اس کی حالت بہت خراب ہو گئی تو دہلو رائے بید بلائے گئے۔ کوئی پچاس کا سن ہو گ۔ ابر ہنہ پا، سر پر ایک پگڑی باندھے، کندھے پر ایک انگوچھا رکھے ہوئے ہاتھ میں موٹا سا سوٹا لیے دروازہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ گھر کے بڑے زمیندار ہیں مگر ان کے بدن پر کسی نے سیدھی مرزئی نہیں دیکھی۔ انہیں اتنی فرصت ہی نہیں کہ اپنی تن پروری کی طرف متوجہ ہوں۔ اس نواح میں آٹھ دس کوس تک لوگ ان کے معتقد ہیں۔

نہ وہ حکیم کو جانیں نہ ڈاکٹر کو، ان کا حکیم ڈاکٹر جو کچھ ہیں وہ دہلو رائے ہیں۔ پیغام سنتے ہی آ جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح سواری پہلے نہیں مانگتے وہ بھی چاک چست تاکہ ان کا وقت ضائع نہ ہو۔

آپ کے گھر آ کر ایسے خاموش بیٹھے رہیں گے گویا گونگے کا گڑ کھا گئے ہیں مریض کو دیکھنے جائیں گے۔ تو اس طرح بھاگیں گے گویا کمرے کی ہوا میں زہر بھری ہوئی ہو۔ تشخیص مرض تجویز دوا۔ سب کچھ دو منٹ میں ختم، دہلو رائے ڈاکٹر نہ سہی، مگر جتنے آدمیوں کو ان کی ذات سے فیض پہنچتا ہے، ان کی تعداد کا اندازہ محال ہے۔ ہمدردی ان کا اصول ہے۔ ان کی صورت دیکھتے ہی مریض کا آدھا روگ دور ہو جاتا ہے ان کے نسخے ایسے سہل اور عام کہ بلا دام کوڑی خرچ کیے منوں بٹور لائیے۔ تین ہی دن میں مادھوی چلنے پھرنے لگی۔ واقعی ان صاحب کی دوا میں اعجاز

ہے۔

یہاں ان دنوں مغلیے او دھم مچائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ جاڑے میں کپڑا دے جاتے ہیں، اور چیت میں دام وصول کر لیتے ہیں۔ اس وقت کوئی عذر نہیں سنتے۔ گالی گلوچ، مار پیٹ بھی باتوں پر اتر آتے ہیں۔ دو تین آدمیوں کو بہت مارا۔ رادھا نے بھی کچھ کپڑے لیے تھے۔ اس کے دروازے پر جا کر سب کے سب گالیاں بکنے لگے۔

تلسا نے اندر سے کواڑ بند کر لیے۔ جب یوں بس نہ چلا تو ایک نے موہنی گائے کھونٹے سے کھول لی اور کشاں کشاں چلا۔ اتنے میں رادھا دور سے آتا دکھائی دیا۔ آتے ہی اس نے لاٹھی کا وہ بھرپور ہاتھ دیا کہ مغلیے کی کلائی لٹک پڑی۔ تب تو مغلیے گرم ہوئے۔ پینتر بدلنے لگے۔ رادھا بھی جان پر کھیل گیا اور دو تین بد معاشوں کو بے کام کر دیا۔ اتنے میں کاشی بھرنے آکر ایک مغلیے کی خبر لی۔ دہلو رائے کو مغلیوں سے چڑ ہے۔ وہ فخر یہ کہا کرتے ہیں کہ میں نے ان کا اتنا روپیہ ڈوبا دیا۔ اتنوں کو پٹوا دیا۔ یہ شور و غل سنتے ہی پہنچ گئے اور للکارا، صدہا آدمی لاٹھیاں لے کر دوڑے اور مغلیوں کی خوب مرمت ہوئی، یقین ہے کہ اب ادھر آنے کی جرأت نہ کریں گے۔

اب تو مئی کا مہینہ گزرا گیا۔ ابھی فرصت نہیں ہوئی۔ رات دن تمہارے آنے کا انتظار ہے شہر میں بیماری کم ہو گئی اور ہم لوگ بہت جلد چلے جائیں گے۔ افسوس تم اس پیارے گاؤں کی سیر نہ کر سکو گے۔

تمہاری

برجن

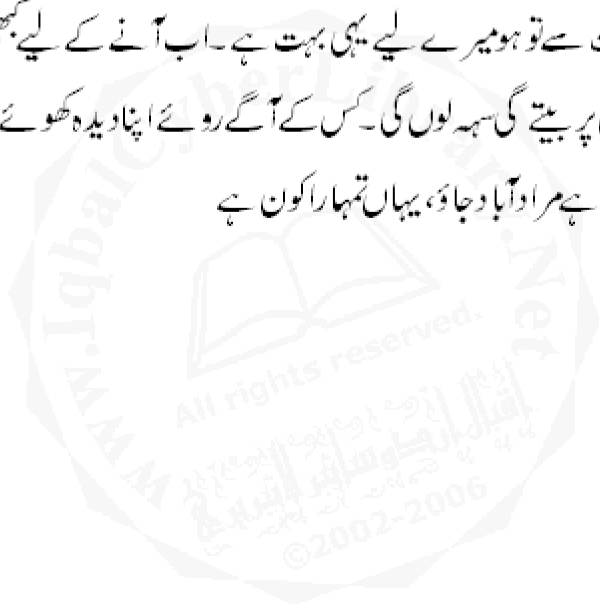
پیارے! تمہاری خاموشی مارے ڈالتی ہے۔کل ہم لوگ شہر آ گئے۔اب تم بھی آؤ۔وہاں پڑے پڑے کیا کر رہے ہو۔دو تین خط لکھ چکی مگر نہ آتے ہو، نہ جواب دیتے ہو،رات دن آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔رات کو آنکھیں نہیں جھپکتیں۔ کتا بھونکا اور میرا دل دھڑ کنے لگا۔بگھی کی آواز آئی اور میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔شاید مجھ سے ناراض ہو۔

خیر یہاں کسی طرح آ جاؤ، تمہاری ناراضگی کا علاج تو میرے پاس ہے۔اب رخصت ہوتی ہوں، چراغ کے سامنے نہیں بیٹھا جاتا۔ایشور کرے سویرے تمہارا درشن ہو اور یہ خط گھومتا ہوا یہیں آوے

تمہاری

برجن

## 9



پیارے! لالہ جی کو خط لکھا اور مجھے نہیں! میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے۔ خیر شکر ہے تم خیریت سے تو ہو میرے لیے یہی بہت ہے۔ اب آنے کے لیے کبھی نہ کہوں گی، جو کچھ دل پر بیتے گی سہہ لوں گی۔ کس کے آگے روئے اپنا دیدہ کھوئے، لو رخصت!

بہت رہے مراد آباد جاؤ، یہاں تمہارا کون ہے

تمہاری

برجن

## بالک رام اور کملا چرن

پرتاپ چند کو الہ آباد کالج میں پڑھتے تین سال ہو چکے تھے اور اس مدت میں اس نے ہم چشموں اور اتالیقوں کی نگاہوں میں بہت ممتاز درجہ حاصل کر لیا تھا۔ کالج کی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا، جہاں اس کے کمالات نے قدر دانی کا سہرا نہ پہنا ہو۔ پروفیسر اس پر فخر کرتے اور طلبا اسے اپنا رہنما سمجھتے۔ جس طرح کھیل کے میدان میں اس کا دست اعجاز نمایاں تھا، اسی طرح لیکچر روم میں اس کی قابلیت اور نکتہ رسی مسلمہ تھی کالج کے متعلق ایک انجمن احباب قائم کی گئی۔ شہر کے علم دوست روسا، کالج کے پروفیسر سب اس کے ممبر تھے۔ پرتاپ اس انجمن کا ماہ درخشاں تھا۔ یہاں ملکی و تمدنی مسائل پر مباحثے ہوا کرتے تھے، اور پرتاپ کی تقریریں ایسی پر زور اور مدلل ہوتیں کہ پروفیسروں کو بھی اس کی وسعت تحقیقات اور تلاش پر حیرت ہوتی۔ اس کی تقریریں اور تحریر دونوں ہی میں جادو تھا۔ جس وقت وہ اپنا سادہ لباس پہنے پلیٹ فارم پر جاتا تو حاضرین کی آنکھیں اس کی طرف اٹھ جاتیں اور دلوں میں گدگدی ہونے لگتی۔ اس کا انداز تقریر، اس کے اشارے، اس کا لب و لہجہ، اس کے اعضاء کی حرکت سبھی ایسے موثر تھے کہ اس کی تقریر میں گویا قدرت نے اثر بھر دیا ہے۔ جب تک پلیٹ فارم پر رہتا حاضرین پر ایک تسخیر کا عالم ہوتا۔ مرحبا کے نعرے بار بار بلند ہوتے۔ اس کا ایک ایک فقرہ دلوں میں چبھ جاتا اور زبان سے بے اختیار واہ واہ کا شور بلند ہوتا۔ اسی خیال سے اس کی تقریریں عموماً اختتام کے وقت ہوا کرتی تھیں کیونکہ زیادہ تر سرکار انجمن صرف اس کی گرم زبانیوں کا لطف اٹھانے کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس کے الفاظ اور انجمن اور انداز میں خداداد اثر تھا جو قوت کسب سے بہت بلند ہے۔ ادب اور تاریخ اس کی تحقیقات اور مطالعہ کے خاص صیغے تھے۔

قوموں کے عروج و زوال اور اس کے اسباب و حالات پر اکثر تقریریں کرتا۔ اس

وقت ان جگر کاویوں کے محرک زیادہ تر حاضرین کے نعرہ ہائے تحسین ہوتے تھے۔ اور انہیں کو اپنی محنت کا کافی بدل سمجھتا تھا۔ ہاں اس کے مذاق کی یہ روش دیکھ کر دیہ البتہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ یہ ہونہار بروا آگے چل کر کیسے کیسے پھول پھل لائے گا اور کیسے رنگ روپ نکالے گا ابھی تک اس نے ایک لمحہ بھر بھی غور نہیں کیا تھا کہ میری آئندہ زندگی ک کیا صورت ہو گی۔ کبھی سوچتا پروفیسر بن جاؤں گا اور خوب کتابیں لکھوں گا۔ کبھی وکالت کی طرف خیال دوڑاتا۔ کبھی سوچتا کاش وظیفہ مل جائے تو سول سروس کی تیاری کر لوں۔ کسی ایک طرف خیال نہ جمتا تھا۔

مگر پرتاپ چندان طلباء میں سے نہ تھا جن کی تمام کوششیں مباحثے اور کتابوں ہی تک محدود رہتی۔ اس کے وقت اور لیاقت کا ایک قلیل حصہ رفاہ عامہ کے کاموں میں بھی صرف ہوتا تھا۔ اس نے خلقتاً ایک ہمدرد اور غریب پرور دل پایا تھا۔ اور عوام میں ملنے جلنے اور کام کرنے کی لیاقت اسے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ انہیں مشاغل میں اس کی توجہ اور سرگرمی پورے جوش میں تھی۔ اکثر شام کے وقت وہ کیٹ گنج کٹرہ کی متعفن گلیوں کی خاک چھانتا دکھائی دیتا جہاں زیادہ تر نیچی ذاتیں آباد تھیں۔ اس کی صورت ان حصوں سے بہت مانوس تھی، جن لوگوں کے سایہ سے اونچی ذات کا ہندو دور بھاگتا ہے۔ ان کے ساتھ پرتاپ ٹوٹی کھاٹ پر بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتا اور یہی وجہ تھی کہ ان محلوں کے بسنے والے اس پر فدا ہونے کو تیار تھے۔ نخوت اور عیش پرستی پر دو عیوب پرتاپ چند میں نام کو بھی نہ تھے۔ کوئی بیکس آدمی ہو پرتاپ اس کی دستگیری کے لیے تیار تھا۔ کوئی بیکس مریض ہو پرتاپ اس کا سچا غمخوار اور تیمار دار تھا۔ کئی راتیں اس نے جھونپڑیوں میں کراہتے ہوئے مریضوں کے سرہانے کھڑے رہ کر گزار دی تھیں۔ اسی غرض سے اس نے رفاہ عامہ کی ایک سبھا قائم کر رکھی تھی۔ اور ڈھائی سال کے مختصر زمانے میں اس انجمن نے جتنی کارگزاری سے پبلک کی سیوا کی تھی۔ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

اس نے الہ آبادیوں کی سیوا اور ہمدردی اس طرف متوجہ کر دی تھی۔ پرتاپ اس انجمن کا روح رواں تھا۔ پچھلے دو سالوں میں اس نے طاعون کے دنوں میں بھی جبکہ لوگ اپنے پیاروں کو چھوڑ دیا کرتے ہیں اب جان ہتھیلی پر رکھ کر طاعون زدہ خطوں میں علاج معالجہ شروع کر دیا تھا۔

کملاچرن جس وقت الہ آباد پہنچا م پرتاپ چند نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ مرورِ ایام نے اس کے دل سے حسد کی آگ بجھا دی۔ جس وقت وہ برجن کی بیماری کی خبر پا کر بنارس پنچا تھا اور اس سے ملاقات ہوتے ہی برجن کی حالت دیکھ کر سنبھل چلی تھی اسی وقت سے پرتاپ چند کو یقین ہو گیا کہ کملاچرن نے اس کے دل میں وہ جگہ نہیں پائی جو میرے لیے مخصوص تھی۔ یہ خیال حسد کا شعلہ فرو کرنے کے لیے کافی تھا، علاوہ اس کے یہ خیال بھی اکثر اسے بے چین کرتا تھا۔ کہ میں ہی سوشیلا کا قاتل ہوں۔ میری ہی بدزبانیاں اس غریب کی جان لیوا ہوئیں اور اسی وقت سے جبکہ سوشیلا نے مرتے وقت اس سے رو رو کر اپنی خطاؤں کی معافی مانگی تھی، پرتاپ نے ارادہ کر لیا تھا کہ موقع ملا تو میں اس گناہ کی تلافی ضرور کروں گا۔

کملاچرن کی خاطر و مدارات اور تعلیم و تربیت نے اسے کسی حد تک پرائشچت کے پورے کرنے کا نادر موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ علم و شعور میں وہ کملاچرن سے منزلوں آگے تھا مگر اس سے یوں پیش آتا جیسے چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے ساتھ اپنے وقت کا کچھ حصہ اس کی مدد کرنے میں صرف کرتا اور ایسی سہولت سے اتالیق کا فرض ادا کرتا کہ تعلیم ایک دلچسپ مباحثہ کی صورت اختیار کر لیتی۔

مگر پرتاپ چند کی ان کوششوں کے باوجود کملاچرن کی طبیعت یہاں بہت گھبراتی۔ سارے بورڈنگ ہاؤس میں اس کے مذاق کا ایک بھی آدمی نہ تھا جس سے وہ اپنا دردِ دل کہتا اور اپنے زخم جگر پر مرہم رکھواتا۔ وہ یار باش، بے فکر رنگین مزاج آدمی تھا جس نے سوائے آج کے کل کا کبھی خیال نہیں کیا۔ پرتاپ سے باوجود بے

تکلفی کے وہ دل کی بہت سی باتیں نہ کہہ سکتا تھا، جب اکیلے پن سے طبیعت بہت اکتاتی تو برجن کو کوسنے لگتا کہ میرے سر پر یہ سب مصیبتیں اسی کی لائی ہیں۔ اسے مجھ سے انس نہیں ہے۔

زبان اور قلم کی محبت بھی کوئی محبت ہے، وہ محبت ہی کیا جو موقع اور مصلحت کی آڑ ڈھونڈنے لگے۔ میں چاہے ان پر جان ہی کیوں نہ دے دوں مگر ان کی محبت زبان او رقلم کے دائرے سے باہر نہ نکلے گی۔

ایسے بت کے روبرو جو پسیجنا جانتا ہی نہ ہو سر پٹکنے سے کیا فائدہ حاصل۔ ان خیالات نے یہاں تک زور پکڑا کہ اس نے برجن کو خط لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ بیچاری اپنے خطوط میں کلیجہ نکال کر رکھ دیتی مگر کملا جواب تک نہ دیتا اور دیتا بھی تو خشک اور دل شکن۔ اس وقت اسے برجن کی ایک ایک بات، اس کی ایک ایک حرکت اس کی سردمہری کا پتہ دیتی تھی۔ ہاں اگر یاد نہ آتی تھیں تو برجن کی خاطر داریاں اور دل سوزیاں، وہ نشیلی آنکھیں جو اس سے جدا ہوتے وقت ڈبڈبا گئی تھیں اور وہ نازک نازک ہاتھ جنہوں نے باہم مل کر اس سے منتیں کی تھیں کہ خط برابر بھیجتے رہنا۔ اسے یاد آجاتے تو ممکن تھا کہ اسے کچھ تسکین ہوتی مگر ایسے موقوں پر انسان کا حافظہ دھوکا دے دیا کرتا ہے۔

آخر کملاچرن نے اپنی تنہائی کا ایک مشغلہ سوچ ہی نکالا۔ جس وقت سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، اسی وقت سے بازار حسن کی سیر شروع کی، حسن پرستی اس کا خمیر ہوگئی تھی۔ اور قسم کا کوئی مشغلہ اس کے لیے ایسا ہی ضروری تھا جیسے بدن کے لیے غذا۔ بورڈنگ ہاؤس سے ملا ہوا ایک سیٹھ کا باغیچہ تھا اور اس کے رکھ رکھاؤ کے لیے ایک مالی نوکر تھا۔ اس نوکر مالی کی ایک دوشیزہ لڑکی سرجو دئی تھی اگرچہ بہت حسین نہ تھی مگر کملا حسن کا اتنا طلبگار نہ تھا، جتنا کسی دل بستگی کے مشغلہ کا۔

کوئی عورت جس کے چہرے پر شباب کی جھلک ہو اس کا دل بہلانے کے لئے

موزوں تھی۔ کملا اس لڑکی پر ڈورے ڈالتے شام سویرے بلا ناغہ چمن کی روشوں پر ٹہلتا نظر آتا۔ اور لڑکے تو میدان میں ورزش کرتے مگر کملا چرن باغیچہ میں آکر تاک جھانک میں مصروف رہتا۔ رفتہ رفتہ اس نے سرجو دیئی سے شناسائی، ہمدردی اور پھر محبت پیدا کر لی۔ اس سے گجرے مول لیتا اور نقد قیمت کے علاوہ چوگنے دام دیتا۔ مالی کو تہوار کے موقع پر سب سے زیادہ تہواری کملا چرن سے ہی ملتی۔ یہاں تک کہ سرجو دیئی بھی اس کے دام الفت کی سیر ہو گئی اور دو ایک بار تاریکی کے پردے میں باہم ملاقاتیں بھی ہوئیں۔

ایک روز شام کا وقت تھا۔ سب طلبا سیر کو گئے ہوئے تھے۔ کملا چرن اکیلا باغیچہ میں ٹہلتا تھا۔ اور رہ رہ کر مالی کے جھونپڑے کی طرف جھانکتا۔ یکا یک جھونپڑے میں سے سرجو دیئی نے اسے اشارہ کیا اور کملا بڑی تیزی سے اندر گھس گیا۔ آج سرجو دیئی نے ململ کی ساڑھی پہنی تھی جو کملا بابو کا تحفہ تھی۔ سر میں خوشبودار تیل ڈالا جو کملا بابو بازار سے لائے تھے اور ایک چھینٹ کا شلوکا پہنے ہوئے تھی جو انہیں بابو صاحب نے بنوا کر دیا تھا۔ یہ سب کملا بابو کی خاطر تھی۔ اپنی طرف سے سرجو دیئی نے صرف آنکھوں میں کاجل لگایا تھا۔ آج وہ اپنی نگاہ میں بہت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ ورنہ کملا چرن جیسا امیر اور حسین آدمی اس پر جان دیتا۔

کملا چرن کھٹولے پر بیٹھا ہوا اس کی اداؤں کی مستانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت سرجو دیئی برجن رانی سے کسی طرح کم حسین نہیں نظر آتی تھی۔ رنگت میں ذرا سا فرق تھا مگر یہ کوئی ایسا بڑا فرق نہیں تھا۔ اس کی نگاہ میں سرجو دیئی کی محبت سچی اور زیادہ پرجوش معلوم ہوتی تھی کیونکہ وہ جب کبھی بنارس جانے کا تذکرہ کرتا تو سرجو دیئی زار زار رونے لگتی اور کہتی کہ مجھے بھی لیتے چلنا۔ میں تمہارا ساتھ نہ چھوڑو گی۔ کہاں یہ محبت کی گرمی اور جذبات کا زور اور کہاں برجن کی نیم دلانہ خاطر داریاں اور بے رحمانہ مصلحت آمیزیاں۔

کملا ابھی اچھی طرح آنکھوں کو سینکنے بھی نہ پایا تھا کہ یکا یک مالی نے دروازہ آ کر کھٹکھٹایا۔ اب کو ٹو تو بدن میں لہو نہیں، چہرہ کا رنگ اڑ گیا۔ سرجو دیٔ سے گڑ گڑا کر بولا۔

"میں کہاں جاؤ؟"

سرجو دیٔ کے آپ ہی ہوش اڑے ہوئے تھے، گھبراہٹ میں زبان سے کچھ بات نہ نکلی۔ اتنے میں مالی نے پھر زنجیر کھٹکھٹائی، سرجو دیٔ بے بس تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایک کواڑ کھول دیا۔ کملا چرن ایک کونے میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔

جس طرح بھینٹ کا بکرا کٹار کے تلے تڑپتا ہے، اسی طرح کونے میں کھڑے ہونے والے کملا کا دل دھڑک رہات حا۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس تھا اور ایشور کو صدق دلی سے یاد کر کے کہہ رہا تھا کہ اگر اب کی بار اس مصیبت سے رہا ہو جاؤں تو پھر کبھی ایسی حرکت نہ کروں گا

اتنے میں مالی کی نگاہ حضرت پر پڑی، پہلے تو کچھ گھبرایا پھر نزدیک آ کر بولا

"یہ کون کھڑا ہے، یہاں کون ہے؟"

اتنا سننا تھا کہ کملا چرن تیزی سے باہر نکلا اور پھاٹک کی طرف بگٹٹ بھاگا۔ مالی ایک ڈنڈا ہاتھ میں لیے "دیکھنا دیکھنا بھاگنے نہ پاوے" کے نعرے مارتا ہوا پیچھے پیچھے بھاگا

یہ وہی کملا چرن ہے جو مالی کو انعام و اکرام دیا کرتا تھا اور جس سے مالی سرکار اور حضور کہہ کر باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ کملا اسی مالی کے سامنے اس طرح جان بچا کر بھاگا جاتا ہے۔

گناہ آگ کا وہ کنڈ ہے جو عزت و حرمت، حوصلہ و ہمت کو چشم زدن میں جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

کملا چرن درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں دوڑتا ہوا پھاٹک سے باہر نکلا، سڑک پر

ٹرام جا رہی تھی۔ اس پر جا بیٹھا اور ہانپتے ہانپتے بیدم ہو کر گاڑی کے تختہ پر بدحواس ہو کر گر پڑا، اگرچہ مالی نے پھاٹک تک بھی پیچھا نہ کیا۔ مگر کملا ہر ایک آنے جانے والے پر چونک کر نگاہیں ڈالتا گویا سارا زمانہ اس کا دشمن ہو گیا مگر ٹکٹ لینے کی سدھ نہ رہی اور نہ یہ معلوم ہوا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ وہ اس وقت اس شہر سے بھاگنا چاہتا ہے۔ خواہ کہیں بھی، کچھ دور چلا کہ ایک انگریز ریلوے افسر لالٹین لیے آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک کانسٹیبل تھا۔ وہ مسافروں کا ٹکٹ دیکھتا چلا آتا تھا مگر کملا نے سمجھا کہ کوئی پولیس کا افسر ہے، خوف کے مارے ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے۔ اور کلیجہ میں دھڑکن ہونے لگی۔ جب تک وہ دوسری گاڑیوں میں معائنہ کرتا رہا تب تک وہ کلیجہ مضبوط کیے بیٹھا رہا۔ مگر جوں ہی اس کے کمرہ کا دروازہ کھلا کملا نے سمجھا کہ کوئی پولیس کا افسر ہے، خوف کے مارے ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے۔ اور کلیجہ میں دھڑکن ہونے لگی جب تک وہ دوسری گاڑیوں میں معائنہ کرتا رہا تب تک وہ کلیجہ مضبوط کیے بیٹھا رہا۔ مگر جوں ہی اس کے کمرہ کا دروازہ کھلا کملا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ایک وحشت کے عالم میں دوسری طرف کا دروازہ کھول کر چلتی ریل سے یوں نیچے کود پڑا۔ کانسٹیبل اور ٹکٹ والے صاحب نے اسے یوں کودتے دیکھا تو سمجھے کوئی مشاق ڈاکو ہے۔ مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے کہ انعام الگ ملے گا اور ترقی اوپر سے ہوگی، فوراً سرخ لالٹین دکھائی ذرا دیر میں گاڑی رک گئی۔

اب گارڈ اور کانسٹیبل اور ٹکٹ والے صاحب چند دوسرے آدمیوں کے ساتھ گاڑی سے نیچے اتر پڑے۔ اور لالٹین لے کر ادھر ادھر تلاش کرنے لگے۔ کسی نے کہا، اب اس کی گرد بھی نہیں ملے گی۔ پکا ڈکیت تھا۔

کوئی بولا ان لوگوں کو کالی جی کا ایشٹ رہتا ہے مگر گارڈ آگے ہی بڑھتا گیا۔ ترقی کی امید اسے آگے لیے جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس مقام پر آ پہنچا۔ جہاں کملا

چرن گاڑی سے کودا تھا۔

اتنے میں کانسٹیبل نے خندق کی طرف اشارہ کر کے کہا ''دیکھو وہ سفید سفید کیا چیز ہے؟ مجھے تو کوئی آدمی معلوم ہوتا ہے''اور لوگوں نے بھی دیکھا اور یقین ہو گیا کہ ضرور بدمعاش یہیں چھپا ہوا ہے''چل کر بچو کو گھیر لو کہ کہیں نکلنے نہ پاوے''

''ذرا سنبھلتے ہوئے رہنا۔ڈاکو جان پر کھیل جاتے ہیں''

گارڈ صاحب نے پستول سنبھالا۔میاں کانسٹیبل نے لاٹھی تانی،چند مسافروں نے جوتے اتار کر ہاتھوں میں لے لیے کہ کہیں وار کر بیٹھا تو بھاگنے میں آسانی ہو گی۔دو چار آدمیوں نے ڈھیلے اٹھا لیے کہ دور ہی سے نشانہ لگائیں گے۔ڈاکو کے نزدیک کون جائے؟ کسے جان بھاری پڑی ہے؟

مگر جب لوگوں نے نزدیک جا کر دیکھا تو نہ ڈاکو نہ ڈاکو کا بھائی بلکہ ایک شریف صورت زادہ،سبزہ آغاز،چھریرے بدن کا نوجوان، بے حس و حرکت زمین پر اوندھے منہ پڑا ہے اور اس کی ناک اور کان سے آہستہ آہستہ خون بہہ رہا ہے۔ برجن کا لال،سرجو دئی نے چھین کر زمین پر پٹک دیا تھا۔

کملا چرن نے ادھر دم توڑا اور برجن ایک بھیانک خواب دیکھ کر چونک پڑی۔ سوجودئی نے برجن کا سہاگ لوٹ لیا۔شراب محبت کا دور ایسا نہ ہوا کہ نہ ساقی رہا نہ ساغر سب خام میں مل گئے۔

## 19

## ہجوم غم

سہاگن عورت کے لیے اس کا شوہر دنیا کی سب سے پیاری چیز ہوتی ہے،وہ اسی کے لیے جیتی ہے اور اسی کے لیے مرتی ہے،اس کا ہنسنا بولنا،اسی کو خوش کرنے کے لیے،اور اس کا بناؤ سنگھار اسی کے لبھانے کے لیے ہوتا ہے،اس کا سہاگ اس کی مسرت اور زندگی ہے اور سہاگ کا اٹھ جانا اس کی زندگی اور جانداری کا خاتمہ ہے۔

کملا چرن کی بے ہنگم موت برج رانی کے لیے موت سے کم نہ تھی۔ اس کی زندگی کی آرزوئیں اور ولولے سب مٹی میں مل گئے کیا کیا ارادے تھے اور کیا ہو گیا۔ ہر دم مرنے والی صورت اس کی آنکھوں میں پھرا کرتی تھی۔ اگر ذرا دیر کے لیے آنکھیں جھپک جاتیں تو اس کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے آجاتی۔

بعض اوقات آفات ارضی و سماوی کو کسی خاص شخص یا خاندان سے انس سا ہو جاتا ہے۔ کملا چرن کا داغ مرجھانے بھی نہ پایا تھا کہ بابو شیاما چرن کی باری آ گئی۔ شاخوں کے کاٹنے سے درخت کو مرجھاتے دیکھ کر اب کی آسمان نے جڑ ہی کاٹ دی۔ رام دین پانڈے بڑا کینہ پرور شخص تھا۔ جب تک ڈپٹی صاحب مجگاؤں میں تھے دبکا بیٹھا تھا۔ مگر جونہی وہ شہر کو لوٹے اس نے اودھم مچانا شروع کر دیا۔ سارا گاؤں کا گاؤں اس کا دشمن تھا۔ جن نگاہوں نے مجگاؤں والوں نے ہولی کے دن اس کی طرف دیکھا تھا وہ نگاہیں اور تیور اس کے کلیجہ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے۔ جس حلقہ میں مجگاؤں واقع تھا اس کے تھانیدار صاحب ایک بڑے گھاگ آزمودہ کار راشی تھے۔ ہزاروں کی رقمیں ہضم کر جائیں مگر ڈکار تک نہ لیں۔ مقدمے بنانے اور ثبوت بہم پہنچانے میں ایسے مشاق تھے کہ راہ چلتے آدمی کو پھانس لیں۔ اور پھر کسی کے چھڑائے نہ چھوٹے۔ حکام ان کے سب ہتھکنڈوں سے واقف تھے۔ مگر ان کی ہشیاری اور معاملہ دانی کے مقابلہ میں کسی کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔ رام دین تھانیدار صاحب سے ملا اور اپنے زخم جگر کی دوا مانگی۔ اس کے ہفتہ بھر بعد مجگاؤں میں ڈاکہ پڑا۔ ایک مہاجن شہر سے آ رہا تھا نمبردار کے ہاں رات کو ٹھہرا۔ ڈاکوؤں نے اسے لوٹ کر گھر نہ جانے دیا۔ صبح کو تھانیدار صاحب تحقیقات کو آئے اور ایک ہی رسی میں سارے گاؤں کو باندھ لے گئے۔

حسن اتفاق سے مقدمہ بابو شیاما چرن کے اجلاس میں پیش ہوا۔ انہیں پہلے ہی سے سارا کچا چٹھا معلوم تھا اور یہ تھانیدار صاحب بہت دنوں سے ان کی آنکھوں پر

چڑھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایسی ایسی موشگافیاں کیں اور ایسے ایسے نکتے نکالے کہ تھانیدار صاحب کی قلعی کھل گئی۔ چھ مہینہ تک مقدمہ چلا اور دھوم دھام سے چلا۔ سرکاری وکیلوں نے بڑے بڑے زور لگائے مگر گھر کے بھیدی سے کیا چھپ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈپٹی صاحب نے سب ملزموں کو رہا کر دیا اور اسی دن شام کو تھانیدار صاحب معطل کر دیئے گئے۔

جب ڈپٹی صاحب فیصلہ سنا کر لوٹے تو ایک ہمدرد اہلکار نے کہا حضور تھانیدار صاحب سے ذرا ہوشیار رہیے گا۔ آج بہت جلایا ہوا تھا۔ پہلے بھی دو تین افسروں کو زک پہنچا چکا ہے، آپ پر بھی ضرور وار کرے گا۔ ڈپٹی صاحب نے سنا اور مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا مگر اپنی حفاظت کے لیے مزید انتظام نہ کیا۔ انہیں یہ خیال بزدلانہ معلوم ہوتا تھا رادھا اہیر بہت ضد کرتا رہا کہ میں آپ کے ساتھ رہوں۔ کاشی بھر بھی بہت پیچھے پڑا رہا مگر انہوں نے کسی کو ساتھ نہ رکھا اور حسب معمول اپنا فرض انجام دیتے رہے۔

ظالم خاں بات کا دھنی تھا۔ وہ زندگی سے ہاتھ دھو کر بابو شیاما چرن کے پیچھے پڑ گیا۔ ایک روز وہ شیاما چرن سیر کر کے شیو پور سے کچھ رات گئے واپس آ رہے تھے کہ پاگل خانہ کے قریب کچھ فٹن کا گھوڑا دبکا اور دم زدن میں ظالم خاں نے ایک درخت کی آڑ سے نکل کر پستول کا نشانہ لگایا۔ پٹاخے کی آواز ہوئی اور بابو شیاما چرن کے سینہ سے گولی پار ہو گئی۔ پاگل خانہ کے گارڈ کے سپاہی دوڑے اور ظالم خاں کو گرفتار کر لیا۔ سائیس نے اسے بھاگنے نہ دیا۔

اس حادثہ نے خاندان کی تباہی کا سامان پورا کر دیا۔ پریم وتی یوں تو بہت نیک مزاج اور محبتی عورت تھی مگر ان حادثات نے اس کے مزاج اور برتاؤ میں یکا یک بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ اس کے حواس میں فرق آ گیا۔ بات بات پر برجن سے چڑ جاتی اور طعنے مارنے لگتی۔ اسے خدا جانے کیونکر وہم ہو گیا تھا کہ یہ سب آفت اسی بہو کی

لائی ہوئی ہے۔ یہی سبز قدم جب سے گھر میں آئی ہے گھر ستیاناس ہو گیا۔ اس کا پودا خراب ہے۔ کئی دفعہ اس نے برجن سے کھول کر کہہ دیا تھا کہ تمہاری چکنی چپڑی صورت نے مجھے موہ لیا تھا۔ میں کیا جانتی تھی کہ تمہارے چرن ایسے منحوس ہیں۔

برجن یہ باتیں سنتی اور کلیجہ مسل کر رہ جاتی۔ جب دن ہی برے آ گئے تو بھلی باتیں کیونکر سننے میں آئیں۔ یہ آٹھوں پہر کی کوفت اسے حسرت کے آنسو بھی بہانے نہ دیتی۔ آنسو نکلتے ہیں جب کوئی ہمدرد ہو۔ اور دلسوزی کرے کوفت اور لعن طعن کی آگ سے آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔

ایک روز برجن کا جی گھر بیٹھے بیٹھے ایسا گھبرایا کہ وہ ذرا دیر کے لیے باغیچہ میں چلی گئی۔ آہ اس باغیچہ میں کیسے کیسے لطف کے دن گزارے تھے۔ اس کا ایک ایک پودا مرنے والے کی محبت بیکراں کی یادگار تھا۔ کبھی وہ دن بھی تھے کہ ان پھولوں اور پتیوں کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا تھا اور نسیم دل پر زخموں کا نشہ پیدا کر دیا کرتی تھی۔ یہی مقام ہے جہاں بہت سی شامیں آغوش محبت میں گزری تھیں، اور شراب محبت کے دور چلے تھے، اس وقت پھولوں کی نازک نازک پنکھڑیاں نازک نازک ہونٹوں کا خیر مقدم کرتی تھیں۔ مگر افسوس آج ان کے سر جھکے ہوئے تھے اور زبان بند تھی۔ کیا یہ وہ جگہ نہ تھی جہاں البیلی مالن پھولوں کا ہار گوندھتی تھی مگر بھولی مالن کو کیا معلومت ھا کہ اسی جگہ اسے اپنی آنکھوں سے نکلے ہوئے موتیوں کے ہار گوندھنے پڑیں گے۔ انہیں خیالوں میں برجن کی نگاہیں اس کنج کی طرف اٹھ گئیں، جہاں سے ایک بار کملا چرن مسکراتا ہوا نکلا تھا۔ گویا وہ پتیوں کی جنبش اور اس کے کپڑوں کی جھلک دیکھ رہی ہے۔ اس کے چہرے پر اس وقت ہلکی سی مسکراہٹ نمودار تھی جیسے گنگا میں ڈوبتے ہوئے آفتا کی زرد اور مہین کرنوں کا عکس پڑتا ہے۔ یکا یک پریم وتی نے آ کر کرخت آواز میں کہا۔

''اب آپ کو سیر کرنے کا شوق چرایا ہے؟''

برجن کھڑی ہوگئی اور روتی ہوئی بولی ''اماں جسے نارائن نے کچلا اسے آپ کیا کچلتی ہیں؟''

آخر پریم وتی شہر سے ایسی بیزار ہوئی کہ ایک مہینہ کے اندر سب سامان اونے پونے بیچ کر مجگاؤں چلی گئی۔ برج رانی کو ساتھ نہ لیا۔ اس کی صورت سے اسے نفرت ہوگئی تھی۔ برجن اس مکان میں اکیلی رہ گئی۔

مادھوی کے سوا اب اس کا کوئی غم خوار نہ تھا۔ سپاما کو اپنی منہ بولی بیٹی کی مصیبتوں کا اتنا ہی صدمہ ہوا جتنا اپنی بیٹی کا ہوتا۔ کئی دن تک روتی رہی اور کئی دن برابر سمجھانے کے لیے آتی رہی۔ جب برجن اکیلی رہ گئی تو سپاما نے چاہا کہ یہ میرے یہاں اٹھ آئے اور آرام سے رہے۔ خود کئی بار بلانے گئی۔ مستری جی کو بھیجا مگر برجن کسی طرح آنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ اسے خیال ہوتا تھا کہ ان کے مرتے ہی ساس اور بہولڑ مریں۔ یہاں تک کہ سپاما کا من اس کی ضد سے موٹا ہوگیا۔

مجگاؤں میں پریم وتی نے ایک اندھیر مچا رکھا تھا۔ اسامیوں کو سخت سست کہتی۔ کارندے کے سر پر جوتی پٹک دی، پٹواری کو کوسا۔ رادھا اہیر کی گائے زبردستی چھین لی۔ یہاں تک کہ گاؤں والے گھبرا گئے اور بابو رادھا چرن سے شکایت کی۔ رادھا چرن نے یہ کیفیت سنی تو یقین ہوگیا کہ ضرور ان صدمات نے اس کے حواس زائل کر دیئے ہیں۔ اس وقت کسی طرح ان کا دل بہلانا چاہیے۔ سیوتی کو لکھا کہ تم اماں کے پاس چلی آؤ اور اس کے ساتھ کچھ دن رہو۔ سیوتی کی گود میں اس وقت ایک چاند سا بچہ کھیل رہا تھا اور پران ناتھ دو مہینہ کی رخصت لے کر در بھنگہ سے لوٹے تھے۔ راجہ صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری ہو گئے تھے ایسے موقع پر سیوتی کیونکر آ سکتی تھی۔ تیاریاں کرتے کرتے مہینوں گزر گئے، کبھی لڑکا بیمار پڑ گیا کبھی ساس روٹھ گئی۔ کبھی ساعت نہ بنی۔ آخر چھٹویں مہینہ جا کر اسے فرصت ملی اور وہ بھی بڑی منتوں کے ساتھ۔

مگر پریم وتی پراس کے آنے کا مطلق اثر نہ ہوا، وہ اس کے گلے مل کر بھی نہ روئی۔ اس کے بچے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ اس کے دل میں اب محبت اور انسانیت نام کو بھی باقی نہ رہی تھی۔ جیسے گنے سے رس نکال کر صرف فضلہ باقی رہ جاتا ہے اسی طرح جس انسان کے دل سے محبت نکل گئی، وہ گوشت پوست کا ایک تو دہ رہ گیا۔ دیوی دیوتا کا نام زبان پر آتے ہی اس کے تیور بدل جاتے تھے۔ مجگاؤں میں جنم اشٹمی ہوئی، لوگ ٹھا کر جی کا برت رکھے ہوئے تھے اور چندہ سے ناچ کرنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں مگر پریم وتی نے عین جنم کے موقع پر اپنے گھر کی مورتی کھیت میں پھنکوادی۔ ایکا دشی برت چھوٹا، دیوتاؤں کی پوجا چھوٹی، وہ پریم وتی ہی نہ تھی۔

سیوتی نے جوں توں کر کے یہاں دو مہینہ کاٹے۔ اس کی طبیعت بہت گھبراتی۔ کوئی سکھی سہیلی بھی نہ تھی جس کے ساتھ بیٹھ کر دن کاٹتی۔ برجن نے تلسا کو اپنی سکھی بنا لیا تھا۔ مگر سیوتی کا مزاج امیرانہ واقع ہوا تھا۔ ایسی عورت سے میل جول وہ اپنے لیے باعث ننگ سمجھتی تھی۔ تلسا بیچاری کئی بار آئی۔ مگر جب دیکھا کہ یہ دل کھول کر نہیں ملتی تو آنا جانا چھوڑ دیا۔

تین مہینہ گزر چکے تھے ایک روز سیوتی دن چڑھے تک سوتی رہی۔ پران ناتھ نے رات کو بہت رلایا تھا۔ جب نیند کھلی تو کیا دیکھتی ہے کہ پریم وتی اس کے بچے کو گود میں لیے چوم رہی ہے۔ کبھی آنکھوں سے لگاتی ہے اور کبھی چھاتی سے چمٹاتی۔ سامنے انگیٹھی پر ہیا پک رہا تھا۔ بچہ اس کی طرف اشارہ کر کے اچکتا ہے کہ کٹورے میں جا بیٹھوں اور گرم گرم حلوہ چکھوں۔ آج اس کا چہرہ کنول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ شاید اس نے تاڑ لیا ہے کہ پریم وتی کے اجڑے ہوئے دل میں پریم نے آج پھر باس کیا ہے۔ سیوتی کو یقین نہ آیا چارپائی پر پڑے نیم باز آنکھوں سے تاک رہی تھی۔ گویا خواب دیکھ رہی ہے۔ اتنے میں پریم وتی پیار سے بولی۔

"بیٹی اٹھو دن چڑھ آیا"

سیوتی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور آنکھیں بھر آئیں۔ آج بہت دنوں کے بعد ماں کے منہ سے محبت کی باتیں سنیں۔ جھٹ اٹھ بیٹھی اور ماں کے گلے لپٹ کر رونے لگی۔ پریم وتی کی آنکھوں سے بھی آنسو کی جھڑیاں لگ گئیں۔ سوکھا پیڑ ہرا ہوا۔ جب دونوں کے آنسو تھمے تو پریم وتی بولی۔

"تمہیں آج یہ سب باتیں اچرج معلوم ہوتی ہے۔ ہاں بیٹی اب اچرج ہی ہیں۔ میں کیسے روؤں۔ جب آنکھوں میں آنسو ہی نہیں رہے۔ پیار کہاں سے لاؤں، جب کلیجہ سوکھ کر پتھر ہو گیا۔ یہ سب دنوں کے پھیر ہیں۔ آنسو ان کے ساتھ اور پیار کملا کے ساتھ۔ آج نہ جانے یہ دو بوند کہاں سے نکل آئے۔ بیٹی میری سب خطائیں معاف کرنا"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ سیوتی زرد ہو گئی۔ ماں کو فرش پر لٹا دیا۔ اس دن سے پریم وتی کا یہ حال ہو گیا جب دیکھو رو رہی ہے۔ باتیں کرتی تو شکر قند گھول دیتی۔ بچے کو گود سے ایک دم کے لیے الگ نہ کرتی۔ مہریوں سے بولتی تو منہ سے پھول جھڑتے۔ پھر پہلے کی جیسی پریم وتی ہو گئی۔ شیریں زبان، رحم دل اور نیک، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل سے ایک پردہ سا اٹھ گیا۔ جب شدت کی برف پڑتی ہے تو بعض ندیاں یخ بستہ ہو جاتی ہیں۔ تب ان میں بسنے والی مچھلیاں اور دریائی جانور چادر برف میں چھپ جاتے ہیں۔ کشتیاں پھنس جاتی ہیں اور اس خوش خرام سیمیں جاں نواز چشمہ آب کی صورت بالکل نظر نہیں آتی۔ حالانکہ برف کی چادر کے نیچے وہ خواب ناز میں مست پڑا رہتا ہے۔ مگر جب گرمی کا راج ہوتا ہے تو برف پگھل جاتی ہے اور دریائے سیم تن برف کی چادر اٹھا دیتا ہے۔ پھر مچھلیاں اور جانور آ بستے ہیں۔ کشتیوں کے بادبان لہرانے لگتے ہیں اور اس کے ساحل پر مردم و مرغ و مور کا جمگھٹ ہو جاتا ہے۔

مگر یہ کیفیت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی۔ ایک ہی ہفتہ میں پریم وتی کی حالت

نازک ہوگئی۔ مزاج کا صحیح ہونا گویا موت کا پروانہ تھا۔ اسی مدہوشی نے اسے اب تک قید حیات میں رکھا تھا۔ ورنہ پریم وتی جیسی نرم دل عورت باعث حوادث کے ایسے جھونکے نہ برداشت کرسکتی تھی۔

سیوتی نے چاروں طرف تار ڈلوائے کہ آکر اماں کو دیکھ جاؤ مگر کہیں سے کوئی نہ آیا۔ پران ناتھ کو رخصت نہ ملی۔ برجن بیمار تھی۔ رہے رادھا چرن وہ نینی تال سیر کرنے گئے تھے۔ پریم وتی کو بیٹے کے دیدار کا شوق تھا۔ مگر جب ان کا خط آ گیا کہ میں اس وقت نہیں آسکتا تو اس نے آکر ایک لمبی سانس لی اور آنکھیں موند لیں اور ایسی سوئی کہ پھر اٹھنا نصیب نہ ہوا۔

## 20

## نفس کی سرکشیاں

انسان کا دل ایک راز سربستہ ہے، کبھی تو وہ لاکھوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا اور کبھی چند پیسوں پر پھسل جاتا ہے۔ کبھی صدہا بے گناہوں کے خون پر اف تک نہیں کرتا اور کبھی ایک بچے کو روتا دیکھ کر رو دیتا ہے۔

پرتاپ چند اور کملا چرن میں اگرچہ برادرانہ محبت تھی مگر کملا کی بے ہنگام موت پر جو صدمہ پرتاپ چند کو ہونا چاہیے تھا وہ نہ ہوا۔ سن کر وہ چونک ضرور پڑا اور ذرا دیر کے لیے مغموم بھی نظر آیا مگر وہ ملال جو کسی شخص کو اپنے سچے دوست کی وفات پر ہوتا ہے اسے نہ ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ شادی سے پہلے اس نے برجن کو اپنی بہن سمجھنا شروع کیا تھا۔ تاہم اس خیال میں اسے پوری کامیابی نہ حاصل ہوئی۔ وقتاً فوقتاً اس کا وہم اس پاک رشتہ کے حدود سے بہت آگے بڑھ جاتا تھا۔ کملا چرن سے اسے بذات خاص کوئی ایسی محبت نہ تھی۔ اس کی جو خاطر و مدارات اور محبت وہ کرتا تھا۔ وہ کچھ تو اس خیال سے کہ برجن سن کر خوش ہوگی، اور کچھ اس خیال سے کہ سوشیلا کی موت کا کفارہ اسی طرح ادا ہوسکتا ہے۔ جب برجن سسرال چلی آئی تو البتہ کچھ دنوں

تک پرتاپ نے اسے اپنے خیالات میں نہ آنے دیا۔ مگر جس وقت سے وہ اس کی بیماری کی خبر پا کر بنارس گیا تھا اور اس کی ملاقات نے برجن پر داروئے شفا کا کام کیا تھا۔ اسی وقت سے پرتاپ کو یقین ہو گیا تھا۔ کہ برجن کے دل میں کملا نے وہ جگہ نہیں پائی جو میرے لیے مخصوص تھی۔

پرتاپ نے برجن کو نہایت پر درد ماتم نامہ لکھا۔ مگر خط لکھتا جاتا تھا کہ اس کا اس پر کیا اثر ہوگا۔ بالعموم ہمدردی محبت کو مضبوط کرتی ہے کیا عجب کہ یہ خط ہی اپنا کام کر جائے۔ علاوہ اس کے چونکہ وہ ذرا مذہبیت کی طرف زیادہ مائل تھا۔ کملا چرن کی موت نے یہ خیال پیدا کیا کہ ایشور نے میری محبت کی قدر کی اور کملا چرن کو میرے راستے سے ہٹایا۔ گویا یہ غیب سے پروانہ ملا ہے کہ اب میں برجن سے اپنی محبت کی داد لوں۔ پرتاپ یوں سمجھتا تو تھا کہ برجن سے کسی ایسی بات کی امید کرنا جو اخلاق اور صداقت کے راستہ سے جو بھر بھی ہٹی ہوئی ہو، حماقت ہے۔ مگر اخلاق اور صداقت کے دائرے میں رہتے ہوئے میری خاطر داری اور دلداری اگر ممکن ہے تو برجن زیادہ عرصہ تک میرے ساتھ بے رحمی نہیں کرسکتی۔ جب میں آنکھوں میں آنسو بھر کر اور عاجزی سے منت کروں گا تو وہ ضرور میری طرف مخاطب ہو جائے گی۔ اور وقت، محبت اور عاشقانہ خاطر داریاں اپنا اپنا کام پورا کر کے رہیں گی۔

ایک مہینہ تک یہ خیالات اسے بے چین کرتے رہے، یہاں تک کہ برجن سے ایک بار پوشیدہ ملاقات کرنے کا بیتابانہ اشتیاق پیدا ہوا۔ یہ وہ جانتا تھا کہ ابھی برجن کے دل پر تازہ صدمہ ہے اور میری بات یا انداز سے اگر میرے نفس کی سرکشیوں کی بو نکلی تو برجن کی نگاہوں سے ہمیشہ کے لیے گر جاؤں گا۔ مگر جیسے کوئی چور روپیہ کا ڈھیر لگا کر دیکھ کر صبر نہیں کرسکتا، اسی طرح پرتاپ اس وقت اپنے تئیں تھام نہ سکا۔ انسان کی قسمت بڑی حد تک موقعوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ مواقع اسے نیک بھی بناتے ہیں اور بد بھی، جب تک کملا چرن زندہ تھا، پرتاپ کے نفس کو کبھی اتنا سر

ابھارنے کا موقع نہ ملا۔ اس کی موت نے گویا جگہ خالی کر دی۔

یہ خود غرضی کا نشہ یہاں تک بڑھا کہ اسے ایک روز ایسا محسوس ہوا کہ برجن مجھے یاد کر رہی ہے۔ اپنی بیتابی سے وہ برجن کی بیتابی کا اندازہ لگانے لگا اور بنارس جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ دو بجے رات کا وقت تھا چاروں طرف موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نیند نے سارے شہر پر ایک گھٹا ٹوپ چادر پھیلا دی تھی۔ کبھی کبھی پیڑوں کی سنسناہٹ سنائی دے جاتی تھی۔ دھواں مکانوں اور درختوں پر ایک سیاہ غلاف کی طرح لپٹا ہوا تھا اور سڑک کی لالٹینیں دھوئیں کی سیاہی میں ایسی نظر آتی تھیں، جیسے بادل میں چھپے ہوئے تارے۔

پرتاپ چندر ریل گاڑی سے اترا تو اس کا دل بانسوں اچھل رہا تھا اور ہاتھ پاؤں کانپتے تھے۔ یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ گناہ کا اسے تجربہ ہوا۔ افسوس کہ دل کی یہ کیفیت عرصے تک قائم نہیں رہتی۔

نفس اس منزل دشوار کو طے کر لیتا ہے جس نے کبھی شراب نہیں پی اسے شراب کی بو سے نفرت ہے۔ شاید پہلی بار وہ پیئے گا تو گھنٹوں اس کا منہ بدمزہ رہے گا اور تعجب کرے گا کہ کیوں لوگ اس زہریلی اور کڑوی چیز کے گرویدہ ہیں۔ مگر چند ہی دنوں میں اس کی نفرت غائب ہو جاتی ہے اور وہ بھی آب سرخ کا غلام ہو جاتا ہے۔ گناہ کا مزہ شراب سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔

پرتاپ چند اندھیرے میں آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ اس کے قدم جلد جلد نہیں اٹھتے تھے۔ کیونکہ گناہ نے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں اس ولولہ مسرت کا جو ایسے موقعوں پر قدموں کو تیز کر دیتی ہے۔

پرتاپ کا سر دھم دھم کر رہا تھا اور خوف سے پنڈلیاں کانپ رہی تھیں۔ سوچتا بچارتا گھنٹہ بھر میں وہ منشی شیاما چرن کی شاندار حویلی کے سامنے جا پہنچا۔

آج تاریکی میں یہ حویلی بہت ہی بھیانک معلوم ہو رہی تھی، جیسے گناہ کا بھوت

سامنے کھڑا ہو۔ پرتاپ دیوار کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ کسی نے اس کے پیر باندھ دیئے۔ آدھ گھنٹہ وہ یہی سوچتا رہا کہ لوٹ چلوں یا اندر چلوں اگر کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔ برجن مجھے دیکھ کر کیا سوچے گی؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری یہ حرکت مجھے ہمیشہ کے لیے اس کی نظروں سے گرا دے۔ مگر ان سب اندیشوں پر شیطان کی کشش غالب آئی۔

نفس کے بس میں ہو کر انسان کی نیک و بد کی تمیز باقی نہیں رہ جاتی۔ اس نے دل کو مضبوط کیا اور اس بزدلی پر اپنے تئیں ملامت کرنے لگا۔

بعد ازاں مکان کے عقب کی طرف جا کر باغیچہ کی چار دیواری سے اندر پھاند پڑا۔ باغیچہ سے مکان کے اندر جانے کے لیے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اتفاق سے وہ اس وقت کھلا تھا۔ پرتاپ کو اس وقت یہ ایک نیک فال سا معلوم ہوا مگر فی الواقع یہ خانہ مصیبت کا دروازہ تھا۔ اندر جاتے وقت پرتاپ کے ہاتھ پاؤں تھرتھرانے لگے۔ دل میں ایسی غضب کی دھڑکن تھی معلوم ہوتا تھا وہ سینہ سے باہر نکل پڑے گا اس کا دم گھٹتا تھا۔ ایمان نے اب کی بہت زور لگایا۔ اپنی ساری قوت صرف کر دی مگر نفس کا پر زور دھارا رک نہ سکا۔

پرتاپ دروازے کے اندر داخل ہوا، اور آنگن میں تلسی کے چبوترے کے پاس چوروں کی طرح کھڑا سوچتا رہا کہ برجن سے کیونکر ملاقات ہو۔ مکان کے سب دروازے بند ہیں کیا برجن بھی یہاں سے چلی گئی؟

یکا یک اسے بند دروازے کی دراڑوں سے ہلکی سی روشنی کی شعاع دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی اس کے جگر نے ایسی قلانچ بھری گویا ہوا میں اڑ جائے گا۔ دبے پاؤں اسی طرف چلا اور دراڑ میں آنکھ لگا کر اندر کی کیفیت دیکھنے لگا۔ اس کی سانس اس وقت بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔

برجن ایک سفید ساڑھی پہنے چہرہ زرد، بال بکھرے ہوئے فرش پر ہاتھ میں قلم

لیے بیٹھی تھی اور دیوار کی طرف دیکھ دیکھ کر کاغذ پر کچھ لکھتی جاتی تھی جیسے کوئی شاعر بحر خیال سے موتی نکال رہا ہو۔ قلم کو دانتوں تلے دبا کر کچھ سوچتی اور لکھتی اور ذرا دیر کے بعد دیوار کی طرف تاکنے لگتی۔

پرتاپ بہت دیر تک سانس روکے ہوئے یہ دلچسپ نظارہ دیکھتا رہا۔ نفس اسے بار بار ٹھوکے دیتا مگر یہ ایمان کا آخری قلعہ تھا۔ اس وقت ایمان شکست کھا جاتا گویا پہلوئے دل میں شیطان کا جگہ پانا تھا۔ ایمان اور نتائج کے خوف نے اس وقت پرتاپ کو اس غار میں گرنے سے بچالیا جہاں سے مرتے دم تک اسے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ غار معصیت سے بچانے والا اس وقت ایمان نہ تھا بلکہ نتائج کے خوف اور پشیمانی کا خیال تھا۔ بسا اوقات جب ہمارا ایمان مغلوب ہو جاتا ہے تو نتائج کا خوف ہم کو بدکرداریوں سے بچالیتا ہے۔ برجن کے چہرے پر باوجود زردی کے ایک ایسی رونق تھی جو قلب کی صفائی اور خیال کی بلندی کا پتہ دے رہی تھی۔ اس کے بشرے کی متانت اور نگاہ کی بلندی کا پتہ دے رہی تھی۔

پاکیزگی میں نفس سرکش کے لیے وہ جاں گداز تازیانہ تھا۔ جس سے پرتاپ کے نفس کا جانبر ہونا محال تھا۔ کیونکہ وہ راہ معصیت میں اس کا یہ پہلا سفر تھا۔ وہ ایسا موثر ہوا کہ رونے لگا۔ نفس کے جتنے خیالات فاسد اس کے دل میں پیدا کر دیئے تھے وہ سب اس نظارے نے یوں غائب کر دیئے جیسے اجالا اندھیرے کو دور کر دیتا ہے۔ اس وقت اسے یہ خواہش ہوئی کہ اس کے پیروں پر گر کر اپنی ان خطاؤں کی معافی مانگ لوں۔

جیسے کسی مہاتما سنیاسی کے روبرو جا کر ہمارے دل کی کیفیت ہو جاتی ہے اسی طرح پرتاپ کے دل میں خود بخود اعزاز و احترام کے خیالات پیدا ہوئے۔ وہ اپنی اخلاقی پستی پر ایسا نادم ہوا کہ برجن کے سامنے جانے کی ہمت نہ پڑی۔ شیطان یہاں تک لایا مگر آگے نہ لے جاسکا۔ وہ الٹے قدم لوٹا اور ایسی تیزی سے باغیچہ میں آیا اور چار

دیواری سے باہر کودا گویا کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔

صبح کاذب کا وقت ہو گیا۔ پرتاپ کے ایمان کی طرح آسمان میں تارے جھلملا رہے تھے، اور چکی کی گھمر گھمر آواز کانوں میں آتی تھی۔

پرتاپ پیر دباتا ہوا آدمیوں کی نظریں بچاتا گنگاجی کی طرف چلا۔ یکایک اس نے سر پر ہاتھ رکھا تو ٹوپی کا پتہ نہ تھا اور نہ جیب میں گھڑی دکھائی دی۔ اس کا کلیجہ سن سا ہو گیا اور دل سے بے اختیار ایک آہ نکلی

بعض اوقات ہماری زندگی میں ایسے واقعات ہو جاتے ہیں جو دم زدن میں اس کی صورت پلٹ دیتے ہیں۔ کبھی والدین کی ایک ترچھی نگاہ بیٹے کو نیک نامی کے ساتویں آسمان پر پہنچا دیتی ہے اور کبھی بیوی کی ایک نصیحت شوہر کو مہاتما رشی بنا دیتی ہے۔ غیرت مند ہستیاں اپنے یگانوں کی نگاہوں میں ذلیل ہو کر دنیا کا بوجھ بننا نہیں برداشت کرسکتیں۔ انسانی زندگی میں ایسے مواقع خداداد ہوتے ہیں۔ پرتاپ چند کی زندگی میں بھی وہ مبارک وقت تھا، جب وہ پیچدار گلیوں میں ہوتا ہوا گنگا کے کنارے آ کر بیٹھا اور افسوس وندامت کے آنسو بہانے لگا۔ نفس کی حوصلہ افزائیوں نے اسے ذلیل وخوار کرنے میں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ مگر اس کے لیے یہ تازیانہ استاد مہربان کا تازیانہ ثابت ہوا۔ کہ یہ تجربہ نہیں کہ زہر بھی بعض اوقات آب حیات کا کام دیتا ہے۔

جس طرح ہوا کا جھونکا سلگتی ہوئی آگ کو دہکا دیتا ہے اسی طرح اکثر دبے دلوں میں دبے ہوئے جوش کو متحرک کرنے کے لیے کسی ظاہری تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی مصیبت کا تجربہ اور دوسروں کی مصیبت کا نظارہ بسا اوقات دل میں وہ بیراگ پیدا کر دیتا ہے جو صحبت مطالعہ اور خلقی مناسبت کے اثر سے بھی ممکن نہ تھا، اگرچہ پرتاپ چند کے دل میں نیک اور بے غرض زندگی بسر کرنے کا خیال پہلے ہی سے تھا مگر نفس کے اس تازیانہ نے وہ منزل ایک ہی لمحہ میں طے کر دی جس کے طے

کرنے میں برسوں لگتے۔اس کی زندگی کا ارادہ مستقل ہو گیا۔معمولی صورتوں میں قومی خدمت ہی اس کی زندگی کا ایک دلچسپ اور غالباً ضروری مشغلہ ہوتی مگر ان واقعات کی تہہ میں کوئی غیبی طاقت متحرک تھی۔کون کہہ سکتا ہے۔

ہردوار سے بہت دور شمال کی طرف پیچدار پہاڑوں میں ایک چشمے کے کنارے ایک نوجوان بیٹھا ہوا نظر آتا تھا، جگہ بہت خوفناک تھی، درندے دن دہاڑے چہل قدمیاں کرتے تھے۔مگر یہ شخص شب و روز ایک ہی چٹان پر بیٹھا رہتا اس کا جگر بہت مضبوط تھا۔اس کے چہرے سے وحشت برستی تھی۔کپڑے پھٹ کر تار تار ہو گئے تھے۔بال بڑھ آئے تھے مگر بظاہر ان باتوں کی اسے مطلق پروا نہ تھی۔

اس کے پاس نہ اوڑھنا تھا نہ بستر، نہ برتن نہ بھانڈے، کبھی کبھی جنگل پھل کھا لیا کرتا تھا۔ایسا بے سروسامان آدمی کس نے دیکھا تھا۔یہ پرتاپ چند تھا۔

پرتاپ چند کو یوں بسر کرتے کئی مہینے گزر گئے۔وہ اپنے نفس سے لڑ رہا ہے مگر فتح نہیں ہوتی تھی اس نے دشمن کو جیسا حقیر سمجھا تھا اس سے بدرجہا طاقتور پایا، جس وقت وہ الہ آباد میں تھا، ذاتی عیش اور تنعم کے خیالات اس کے دل میں نام کو بھی نہ آتے تھے مگر اس ویرانے میں بار بار اس کا خیال انہیں باتوں کی طرف جھکتا۔وہ خیالات کے مجتمع کرنے میں کامیاب نہ ہوتا۔اکثر اس کی نگاہوں کے سامنے ایک نازنین کی تصویر آ کر کھڑی ہو جاتی جو برجن سے بہت مشابہ تھی۔

تخیل ایک عالیشان مکان بنواتا، اسے شیشہ و آلات و نواز سے سجاتا۔جاں بخش نغموں کی میٹھی الاپ کانوں میں آنے لگتی۔عاشقانہ چھیڑ چھاڑ اور معشوقانہ شریر اداؤں کے دور چلنے لگتے۔گھنٹوں اسی پرسرور خواب کے مزے اڑاتا۔پھر یکایک چونک اٹھتا کہ میں کیا بیہودہ باتیں سوچ رہا ہوں اور خیالات کو ادھر سے ہٹا کر مسئلہ پیش نظر پر جماتا۔مگر جھرنوں کی شیریں نوائیاں اور غزالوں کی کلیلیں خیالات کے

قدم میں زنجیر گراں بار کا کام کرتیں۔ یہاں تک کہ وہ اٹھ کھڑا ہوتا اور دل میں کہتا کہ میری زندگی یونہی خواب دیکھنے میں گزرے گی۔

رفتہ رفتہ اس کی یہ حالت ہو گئی کہ کھانے پینے کی مطلق سدھ نہ رہتی۔ سویرے سے شام تک دیوانہ وار بیٹھا ہوا درختوں کی شاخوں اور پتھر کی چٹانوں سے نظریں ملایا کرتا تھا خیال کی طاقت بڑی زبردست ہوتی ہے۔

قومی خدمت کے خیال میں غرق رہتے رہتے اس کے دل میں درد کا سچا جذبہ پیدا ہوا جس کے بغیر بے غرض خدمت محال ہے۔ کسی بوڑھے ضعیف کو لکڑیاں توڑتے دیکھتا تو خود اس کی لکڑیاں توڑ کر اس کے گھر تک پہنچا آتا۔ بھولے بھٹکے مسافروں کو ساتھ لے کر آبادی تک جاتا۔ ان کاموں میں اسے روحانی مسرت حاصل ہوتی۔ یہاں تک کہ آس پاس کی آبادیوں میں ان نیک کاموں کا شہرہ ہو گیا۔ لوگ سمجھنے لگے کہ کوئی مہاتما رشی ہیں۔

عورتیں آتیں کہ مجھے سال بھر سے لڑکا نہیں ہوا۔ کوئی تعویذ دیجیے۔ مرد آتے کہ میرے روزگار کی فکر کر دیجیے۔ آخر پرتاپ چند یہاں سے بھاگا اور دشوار گزار گھاٹیوں کو چیرتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ یہاں ایک اونچی چوٹی پر ایک چھوٹی سی منڈیا تھی۔ اس کے قریب ایک چٹان پر اس نے اپنا آسن جمایا۔

یہاں رہتے اسے چھ مہینے گزر گئے اور اب اسے اپنے دل میں ایک باطنی طاقت محسوس ہونے لگی۔ جذب خیال کی قوت پیدا ہو گئی۔ مگر اس کی آتما ابھی تک کمزور تھی۔ اس کا ثبوت بھی اسے جلدی مل گیا۔

ایک روز وہ شام کے وقت بیٹھا ہوا تھا کہ یکا یک شیر کی ہولناک گرج اس کے کانوں میں آئی۔ آواز سنتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور دل دھڑ کنے لگا۔ مگر وہ سنبھل کر بیٹھا اور ادھر ادھر چوکنی نگاہوں سے تاکنے لگا کہ آواز کدھر سے آئی ہے۔

کیا دیکھتا ہے کہ خونخوار شیر چشمہ کے کنارے ایک بے بس ہرن پر ٹوٹ پڑا ہے اور اپنے آہنی جبڑے اس کی گردن میں چھبو رہا ہے۔

اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ یہ ہیبت ناک نظارہ دیکھ کر اس کا ہیاؤ چھوٹ گیا۔ وہ بے اختیاری طور پر اٹھا اور سوچنے لگا کہ مندر میں جا چھپوں مگر اسی اثناء میں ایک لاغر اندام شخص جس کی ریش دراز ناف تک آئی ہوئی تھی اور چہرہ بدر کامل کی طرح منور تھا۔ ہاتھ میں ایک گنڈا سا لیے نکلا اور دلیرانہ قدم بڑھاتا ہوا شیر کے سر پر جا پہنچا۔ شیر جھلایا تو تھا ہی، شعلہ بار آنکھوں سے گھورتا ہوا دوڑا مگر نزدیک آتے ہی اس کی آنکھیں جھپک گئیں اور ایک خطاوار شخص کی طرح جو اپنے آقا سے معافی کا طالب ہو زمین پر لیٹ گیا۔

سادھو نے آتے ہی نیم جان کو آغوش میں اٹھا لیا اور مندر میں لا کر مرگ چھالے پر لٹا دیا۔ چند بوٹیاں پتھر پر گھس کر اس کے زخموں پر لگائیں اور تب اپنی کفنی کو جس پر تازہ گلابئے خون زیب دے رہے تھے، دھونے کے لیے چشمے کی طرف چلا۔ کوئی شیو کا پجاری کمل کے پھولوں کو جل دان کے لیے جاتا ہو۔

پرتاپ چند اس حیرت انگیز کرشمے سے اتنا متاثر ہوا کہ کچھ دیر تک نقش دیوار کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر سوچنے لگا، افسوس! کیا میری آتما اتنی کمزور ہے؟ کیا مجھے اپنی جان اتنی پیاری ہے۔

پرتاپ چند اپنی بزدلی پر ایسا جھنجھلایا کہ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ خون جوش کھانے لگا۔ ایک مضبوط لکڑی کا کندہ اٹھا کر کسی بدمست شرابی کی طرح لڑکھڑاتی ٹانگوں سے دوڑتا ہوا شیر کے کلّے پر جا پہنچا۔

شیر نے دیکھا اور دیکھتے ہی اس کے تیور بدل گئے۔ بادل کی طرح گرجا اور قریب تھا کہ جست مار کر پرتاپ کی گردن دبوچ لے کہ اتنے میں لکڑی کا کندہ اپنی پوری طاقت سے اس کے سر پر پٹک دیا۔ مگر شیر کے فولادی سر پر اس کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔

وہ اور بھی جھلایا اور زور سے گرجا کہ جنگل کے تمام جانور اپنی کمین گاہوں سے نکل پڑے اور دونوں اگلے پنجوں کو شیر نے پرتاپ کی کمر میں ڈال دیا۔ دفعتاً اس کے سر پر گنڈاسے کا بھرپور ہاتھ پڑا۔ طیش کھا کر پیچھے کی طرف دیکھا تو سادھو بابا کھڑے ہیں۔ اس نے فوراً پرتاپ کو چھوڑ دیا اور درد سے کراہتا ہوا بھاگا۔

پرتاپ چند نے ان باباجی کو اکثر مندر سے آتے جاتے دیکھا تھا مگر اس وقت جو اور نزدیک سے ان کے پرجلال چہرے پر نگاہ ڈالی تو صورت کچھ مانوس سی معلوم ہوئی۔ سوچنے لگا کہ میں نے انہیں کہاں دیکھا ہے؟ مگر حافظے نے یاری نہ دی۔ ندامت سے سر جھکا کر بولا

"میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟"

سادھو جی نے مسکرا کر فرمایا

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ برسوں آپ کی گود میں کھیلا ہوں"

اتنا سنتے ہی پرتاپ کی آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔ کلیجہ نے جست ماری لبوں تک آپہنچا۔

ایک فرزندانہ پرجوش اور بے خودی کے ساتھ ان کے سینے سے لپٹ گیا اور آنکھوں سے آنسو کے قطرے گرنے لگے۔

منشی سنجیون لال نے پدرانہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آنسو پونچھنے لگے۔

## 21

## تیاری

جیسے کوئی منجدھار میں پڑی کشتی طوفان کے تھپڑوں اور تلاطم کے جھکولوں سے اپنی جان بچا کر کسی بندگاہ کی آغوش میں جا پہنچتی ہے۔ اسی طرح پرتاپ چند اب ایک ایسے مسکن میں آگیا تھا جہاں اس کے دماغ کو اطمینان تھا اور دل کو قرار۔

وہ اب اس بھولے بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح نہ تھا جو اندھیری رات میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہو۔ اب اسے اپنا راستہ اور منزل مقصود صاف نظر آتے تھے۔ منشی سنجیون لال کی صحبت اور تلقین نے چند ہی مہینوں میں اس کے دل سے وہ کمزوریاں محو کر دیں جنہیں وہ سخت کوششوں کے بعد بھی دور کرنے میں پورے طور پر کامیاب نہ ہوا تھا۔ ایک عارف کامل کی چند روزہ تزکیہ نفس کے لیے برسوں کی اندرونی کشمکش اور مطالعہ سے بدرجہا بہتر زیادہ مفید ہوتی ہے۔

منشی جی اسے ہر روز بھگوت گیتا پڑھاتے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بحر عمیق کی غواصی میں صرف کیا تھا اور ادھر تین چار سال تک ہی یوگیوں اور سنیاسیوں کے خرمن دانش سے خوشہ چینی کی تھی۔ وہ ایک ایک نکتہ چینی کی ایسی تشریح کرتے۔ ان کا لہجہ ایسا دلکش اور طرز بیان ایسا سرور انگیز تھا کہ پرتاپ پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا۔ ان کے ایک ایک لفظ میں وہ اثر ہوتا تھا جو کسی خانقاہ روحانیت کے بسنے والے ہی کی باتوں میں ہو سکتا ہے۔

پرتاپ چند کے خیالات روز بروز زیادہ پاک، زیادہ بے غرض اور حوصلے زیادہ وسیع اور زیادہ بلند ہوتے جاتے تھے۔

اس نے یوگ کی مشق بھی شروع کر دی تھی، جوں جوں اس میدان میں وہ آگے قدم بڑھاتا تھا، اس کی ہمدردیاں زیادہ وسیع اور عام ہوتی جاتی تھیں۔

اس طرح دو سال گزر گئے۔ پرتاپ چند کے قوائے جسمانی شیروں کی طرح مضبوط اور تنومند ہو گئے۔ اونچی سے اونچی پہاڑیوں پر بے تکان چڑھ جاتا۔ منزلوں کی مسافت طے کر کے یوں آ بیٹھتا گویا کسی باغ کی سیر کر کے لوٹا ہے۔

قوت برداشت اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ برفستانی پر سنگین چوٹیوں پر کا بستر بنا کر ایسے آرام سے لیٹتا گویا آراستہ مکان میں مخملی گدوں پر لیٹا ہوا ہے۔ اس کا چہرہ ایسا روشن ہو گیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں جھپک جاتیں۔ اس پرشانوں تک بکھرے

ہوئے بال، درد سے بھری ہوئی آواز اور آنکھیں اسے رحم کی مورت بنائے ہوئے تھیں۔ روشن رخساروں پر سبزہ نودمیدہ ایسے معلوم ہوتے تھے گویا پروانے شمع پر نثار ہو رہے ہیں۔ کیسا حسن مردانہ تھا کہ پہلی ہی نظر میں اس کی تصویر پردہ دل پر ہمیشہ کے لیے کھینچ جاتی تھی۔

یقیناً جب وہ اپنا آسن بچھا کر یوگ سادھن کرتا ہو گا تو کیلاش کی بسنے والی اپسرائیں اس پر نثار ہوتی ہوں گی۔ جس وقت وہ جڑی بوٹیوں کو بقچہ لے کر قدم بڑھاتا ہوا چلتا تو پہاڑوں کے بسنے والے مرد اور عورتیں اضطراری طور پر اس کے روبرو سر جھکاتے اور جس وقت جھاڑیاں اور چٹانیں اسے اپنے دامنوں میں چھپا لیتیں اس کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھا کرتے۔ اس کے علاج میں تاثیر تھی۔ باتوں میں وہ مٹھاس اور آنکھوں میں وہ جادو کہ گردونواح کے لوگ یہ سمجھتے کہ وہ دیولوک کا رشی ہے

ایک روز سنجیون لال نے پرتاپ چند سے کہا۔

"بالانند جی! چلو اب تمہیں دوسرے مقامات کی سیر کراؤں۔ اس پاک سرزمین پر کتنے ہی سنیاسی اور رشی دنیا سے مونہہ موڑ کر بھگوت بھجن کر رہے ہیں۔ میں نے ایک بار سب کے درشن کر لیے ہیں مگر اب پھر ان کے درشن کرنے کے لیے جی بے چین ہو رہا ہے"

پرتاپ: "میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ یہاں سے کس طرف کا مقصد ہے؟"

سنجیون لال "پہلے سنت دھام کو چلیں گے، وہاں کئی مہاتماؤں کے درشن ہوں گے۔ وہاں سے پورب کی طرف کیلاش ہے، کیلاش سے سیدھے گیان سرور کی طرف سدھاریں گے۔ ایسا دلکش مقام پردہ زمین اور کہیں نہ ہوگا۔ عین ساگر کے کنارے شری برہمانند جی کا دھام ہے۔ ان کے قدموں پر سر جھکائیں گے۔ مجھے کتنے ہی رشیوں سے فیض محبت کا موقع ملا ہے مگر برہمانند جی تاروں میں چاند ہیں

تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے''

پرتاپ چند نے روانگی کی تیاری کرنی شروع کی اور تیاری کیا تھی۔ دو مرگ چھالے، جڑی بوٹیوں کا بقچہ اور چند کتابیں اس مسکن کی ساری کائنات تھی۔ انہیں اس نے بغل میں دبایا اور دونوں چل کھڑے ہوئے۔

مگر ابھی یہ پہاڑی سے اترے بھی نہ تھے کہ جنگلی جانوروں کے غول چیختے چلاتے اچھلتے کودتے نظر آتے۔ ہرن، بکریاں، ریچھ، شیر، چیتے سب کے سب پہلو بہ پہلو بھاگے چلے آتے تھے۔ گویا ہر ایک اپنی دھن میں ایسا مست تھا کہ اسے دوسروں کی خبر نہ تھی کہ آن کی آن میں ان جانوروں نے ان دونوں بھگوڑوں کے گرد حلقہ باندھ لیا۔

کوئی ان کے ہاتھ چاٹنے لگا۔ کوئی پیروں کے اوپر سر رگڑنے لگا۔ کوئی دردناک آواز میں چیخ رہا تھا کوئی اکڑوں بیٹھا ہوا زمین کی طرف تاک رہا تھا۔ گویا اپنے محسن کی جدائی کا صدمہ اظہار کی قابلیت سے بہت زیادہ دلدوز تھا۔ بے زبانوں کے دل میں بھی وہی جذبہ محبت اور وہی صدمہ فراق ہوتا ہے جو حضرت انسان کی زندگی تلخ کر دیتا ہے۔ اگرچہ اس کا اظہار صرف انہیں لوگوں کے روبرو ہوتا ہے جن کی اندرونی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور جن کی آتمائیں اس قدر وسیع کہ جسم ظاہر کی نیر نگیاں ان کا احاطہ نہیں کرسکتیں۔

ایک یہ کہ اس کوہستان کے ذی روح سے ان دونوں آدمیوں کو سچی ہمدردی تھی۔ ان کا مسکن ان بے زبانوں کی خوش فعلیوں کا نظارہ کا اکھاڑا تھا اور ان کے ننھے ننھے خوبصورت بچوں کے سونے کا گہوارہ اور کلیلیں کرنے کا میدان، اس پر سحر حلقہ میں آ کر ان کی باہمی رنجشیں اور کدورتیں مٹ جایا کرتی تھیں۔

شام ہو گئی تھی اور دونوں آدمی مردانہ وار قدم بڑھاتے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، اس کوہستان کے ایک ایک کونے اور گوشتہ گوشہ کا نقشہ ان کا نگاہ میں کھنچا ہوا تھا نہ

ان کے قدم پھسلتے تھے نہ ان کے قدم ڈگمگاتے تھے۔ تیرہ و تار وادیاں جہاں شاید کسی ذی روح نے قدم نہ رکھا تھا۔

عمودی چوٹیاں جس کی بلندی کو پرندے بھی نگاہ حسرت سے دیکھیں۔ ان کے لیے ایسے سہل گزار راستے تھے جیسے کوئی صاف ستھری سڑک یا کسی باغ کی روش، ان کے دل مردوں کے دل تھے اور اعضاء شیروں کے

پرتاپ کا تو خیر عنفوان شباب تھا مگر منشی جی بھی باوجود پیرانہ سالی کے ایک چٹان سے دوسری چٹان پر کود جاتے اور پرشور کوہستانی نالوں میں بے محابا گھس پڑتے، گویا ان موانعات ظاہری کی ان کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں تھی۔

اسی طرح بادہ پیائی میں کئی مہینے گزر گئے۔ دن بھر راستہ چلتے اور رات کو کسی مہاتما رشی کے استھان پر ٹھہر جاتے اور اس کے ست سنگ سے فیض یاب ہوتے۔ پرتاپ چند کو اکثر یہ خیال گزرتا کہ اگر یہ فطرت قدسی کی صفایت کے ساتھ خدمات کی طرف متوجہ ہوتے تو فکر و فریب، جور و جبر کا نشان مٹا دیتے۔ کیسے روشن دل لوگ تھے۔ کیسے مستغنی، دولت و شہرت، ثروت و جاہ، نام و نمود اور دوسری دنیاوی نعمتیں جو حضرت انسان کی زندگی کا معراج خیال کی جاتی ہیں، ان کی نگاہوں میں محض سنگریزے تھے جو حقیقت کے موتے اور گیان و سرور کے نواح میں آ پہنچے۔

آہ کیسا سہانا منظر تھا۔ اسے دلکش کہنا، اس کی مذمت کرتا ہے۔ اگر دنیا میں کوئی جگہ ایسی ہی ہے جسے اس کی آنکھ کہہ سکیں تو وہ کوہ ہمالیہ ہے اور یہ جگہ اس کی آنکھ کی پتلی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جسے پرانوں میں دیولوک کا مقدس نام دیا گیا ہے۔ یہاں گندھرب اور اپسرائیں بستی ہیں اور ان کے بہشتی نغموں کی دلآویز صدا شوق کے کانوں میں آتی ہے۔ پرتاپ پر اس منظر نے خود مستی کی کیفیت طاری کر دی۔ نگاہیں ادھر سے ہٹنے کا نام نہ لیتیں۔

روح اور قلب پر ایک تقدس آمیز رعب چھا رہا تھا۔ کوئی کیسا ہی بے اعتقاد شخص

کیوں نہ ہوگر اس پاک سرزمین میں داخل ہوتے ہی اس کی روح پر وہ سرور ہوگا جو اسے مدت العمر یاد رہے گا۔

یہاں کی ہوا میں سانس اور یہاں کی زمین پر قدم رکھنا جام روحانیت سے شاد کام ہونا ہے۔ دونوں طرف نگاہ جہاں تک جاتی ہے سربفلک پہاڑیوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ ایک کے اوپر ایک دلپذیر بے قاعدگی کے ساتھ لدی ہوئی ہے۔ گویا آسمان پر منڈلانے والے بادل یہاں تک سیر کرنے کے لیے اتر آئے ہیں۔ ان کی چوٹیوں پر جابجا برف کے تودے پڑے ہوئے ہیں۔ جنہیں آفتاب کی آخری شعاعوں نے زرنگار بنا دیا ہے۔ جیسے اتنی بلندی پر روحان شمسی کے لیے سنہری تخت سجائے گئے ہوں۔

انہیں پہاڑیوں کے بیچ میں گیان سرور آہستہ آہستہ موجیں مار رہا تھا۔ گیان کی طرح اتھاہ اور اپار اس میں ہنس، بط اور بگلے خوش فعلیاں کر رہے تھے گویا آسمان پر تارے نکلے ہوئے ہوں۔

یکا یک منشی سنجیون لال نے کہا

"بالا جی، دیکھو، جھیل کے کنارے وہ چھوٹی سی کٹی جو نظر آ رہی ہے وہی برہمانند جی کا استھان ہے"

یہ سنتے ہی اشتیاق نے پرتاپ چند کے قدم اور بھی تیز کر دیئے۔ ذرا دیر میں دونوں کٹی کے دروزے پر پہنچ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سوامی براہمانند جی جھیل کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے سندھیا کرنے میں مصروف ہیں۔

ان کا چہرہ ایسا پر جلال تھا گویا آفتاب ابھی ابھی گیان سرور کے آغوش سے نکل آیا ہے۔

جب سے منشی سنجیون لال تیرتھ یاترا کو نکلے اور پرتاپ چند الہ آباد چلا گیا اس وقت سے سباما کی زندگی کی روش بالکل تبدیل ہوگئی تھی۔ اس نے ٹھیکہ کے کاروبار کو ترقی دینا شروع کیا اور اسے نہایت وسیع پیانے پر پہنچا دیا۔

مستری جی بدستور دیانتداری اور ہوشیاری سے اپنا کام کرتے تھے۔ منشی سنجیون لال کے زمانے میں بھی کاروبار کو اتنا فروغ حاصل نہ ہوا تھا۔ سباما رات کی رات بیٹھے اینٹ پتھر سے سر مارا کرتی تھی اور سرخی چونے کی فکر میں پریشان رہتی۔ پائی پائی کا حساب جانچتی۔ اور کبھی کبھی مزدوروں کے کام کی دیکھ بھال کرتی۔

ان کاموں میں اسے ایسا انہاک ہوا کہ دان اور برت سے جو اس کے پرانے شغل تھے کسی قدر لاپرواہی ظاہر ہونے لگی۔ باوجود روز افزوں آمدنی کے سباما نے خرچ کی کوئی مد زیادہ نہ ہونے دی۔ کوڑی کوڑی دانتوں سے پکڑتی اور یہ سب اس لیے کہ پرتاپ چند صاحب مال ہو جائے اور اپنی زندگی فارغ البال وخوش حال رہے۔

سباما کو اپنے ہونہار بیٹے پر ناز تھا۔ اس کی زندگی کی رفتار دیکھ دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ جو آرزو دل میں رکھ کر میں نے اولاد مانگی تھی وہ آرزو پوری ہوگی، وہ کالج کے پرنسپل اور پروفیسروں سے پرتاپ کا خفیہ طور پر پتہ دریافت کرتی تھی اور ان کی رپورٹوں کا مطالعہ اس کے لیے ایک دلچسپ افسانہ تھا۔ ایسی صورت میں الہ آباد سے پرتاپ چند کے لاپتہ ہو جانے کا تار پہنچنا گویا دل و دماغ پر بجلی کا گرنا تھا۔

سباما نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سر تھام کر بیٹھ گئی

تیسرے دن پرتاپ چند کی کتابیں، کپڑے اور دوسرے اسباب بھی آ پہنچے۔ یہ زخم پر ایک اور چرکہ تھا۔ ایک دن وہ پرتاپ چند کی کتابیں الٹ پلٹ رہی تھی کہ اسے ایک ریشمی رومال میں بہت سے خطوط حفاظت سے لپٹے ہوئے دکھائی دیئے۔

یہ برجن کے خطوط تھے، سباما انہیں پڑھنے لگی اور ایک ایک کر کے سارا دفتر ختم کر

ڈالا۔ آج وہ بہت روئی، دوسرے دن برجن نے جب خبر سنی تو وہ گھبرائی ہوئی سباما کے یہاں آئی۔ سباما نے خطوط کا ایک پلندہ اس کے سامنے پھینک دیا اور منہ پھیر لیا۔ برجن کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور پر غرور لہجہ میں بولی

''چچی! اس بدگمانی پر آپ بہت پچھتائیں گی!''

یہ کہہ کر وہ الٹے قدم اپنے گھر لوٹ آئی

پریم وتی کے مرنے کی خبر پاتے ہی پران ناتھ پٹنہ سے اور رادھا چرن نینی تال سے روانہ ہوئے۔ اس کے جیتے جی آتے تو ملاقات ہوتی۔ مرنے پر آئے تو مٹی دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئی۔

مرتک شریر سنسکار سب بڑی دھوم دھام سے ادا کیے گئے۔ دو ہفتہ گاؤں میں خوب چہل رہی۔ اس کے بعد رادھا چرن مراد آباد چلے گئے۔

اور پران ناتھ نے پٹنہ چلنے کی تیاری شروع کی، ان کا ارادہ تھا کہ بیوی کو الہ آباد پہنچاتے ہوئے پٹنہ جائیں مگر سیوتی نے ضد کی کہ جہاں یہاں تک آئے ہیں تو برجن کے پاس بھی ضرور چلنا چاہیے، ورنہ اسے صدمہ ہوگا۔ سمجھے گی کہ مجھے بیکس سمجھ کر ان لوگوں نے بھی تیاگ دیا۔ للو نے بہت حیل و حجت کی کہ مجھ سے جواب طلب ہو جائے گا۔ معطل ہوجاؤں گا۔ کیا عجب ہے کہ تنزلی کی نوبت آجائے۔ آخر سیوتی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ان کی طرف اس انوکھی ادا اور نگاہ سے دیکھا جس میں مایوسی بھی تھی، ضد بھی اور رضا بھی تھی، اور محبت بھی

للو اس نگاہ سحر کی تاب نہ لا سکے۔ رضا نے وہ کام کر دکھایا جو ضد سے مشکل تھا۔ بیوی کے گل عارض کا بوسہ لے کر بولے

''رو دیں کیوں؟''

سیوتی: ''اچھا تمہارا ہی کہنا کریں گے، لو اب خوش ہو جاؤ!''

للو مد ہوش ہوگیا۔ اس نگاہ میں خموں کا نشہ ہے، اسی نگاہ نے گھر کر دیئے ہیں ہگلوں

پر خنجر چلا دیئے ہیں۔ سلطنتیں مٹا دی ہیں۔ للو نے تو کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا صرف ایک معزز عہدہ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایک ننھی سی آنکھ میں کتنی طاقت ہے۔

سیوتی کا اس ویران خانہ میں آنا گویا پھولوں میں مہک کا آنا ہے۔ ہفتہ بھر کے لیے اچھے دنوں کی بو باس آ گئی۔ برجن بہت خوش ہوئی اور خوب روئی،

مادھوی نے منو کو گود میں لے کر خوب سا پیار کیا مردانے کمرے مہینوں سے بند تھے آج ان کی قسمتیں بھی کھلیں اجڑا ہوا آشیانہ بسا

پریم وتی کے چلے جانے کے بعد برجن اس گھر میں اکیلی رہ گئی تھی صرف مادھوی اس کی انیس و غمخوار تھی۔ اس تنہائی، سوز جگر اور درد دل نے نام کو زندہ جاوید بنا دیا۔ وہ شعر و سخن میں طبع آزمائی کرنے لگی۔

شاعری سچے جذبات کی تصویر ہے اور سچے جذبات خواہ وہ درد کے ہوں یا مسرت کے، اسی وقت دل میں پیدا ہوتے ہیں جب ہم درد یا مسرت کا مزہ چکھتے ہیں اور جذبات کے پیدا ہونے کے بعد ان کا زبان قلم پر آنا تو ایک آسان بات ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ سوز اور بیراگ کا ایک ایک دفتر ہوتا ہے۔

دوسرے شاعروں کے دل میں دوستوں کی واہ واہ، اور سخن سنجوں کی سبحان اللہ سے ولولے پیدا ہوتے ہیں مگر برجن اپنی داستان غم اپنے ہی دل کو سناتی تھی۔ اس کے بلند خیالوں کی داد دینے والی شمع خاموش تھی اور سمند فکر کو تازیانہ لگانے والی بے کسی تھی۔

سیوتی کو آئے دو تین دن گزرے تھے ایک دن اس نے برجن سے کہا

"میں تمہیں اکثر کسی گہرے خیال میں ڈوبا ہوا پاتی ہوں اور کچھ لکھتے بھی دیکھتی ہوں مجھ کو نہ بتاؤ گی"

برجن شرما گئی بہانہ کرنے لگی کہ کچھ نہیں یونہی جی کچھ کھویا سا رہتا ہے، سیوتی نے کہا۔ میں نہ مانوں گی۔ یہ کہہ کر وہ برجن کا صندوقچہ اٹھا لائی۔ جس میں شاعری کے

آبدار موتی رکھے ہوئے تھے۔ مجبور ہوکر برجن نے اسے اپنی تازہ نظم سنائی۔ منہ سے پہلے مصرعہ کا نکلنا تھا کہ سیوتی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جب تک ساری نظم ختم نہ ہوئی وہ نقش حیرت بنی بیٹھی رہی پران ناتھ کی صحبت نے اس میں سخن فہمی کا مادہ پیدا کر دیا تھا۔ ہر تازہ مصرعہ سے اس کے گوشہ جگر میں ایک کسک سی ہوتی تھی اور آنکھیں بھر بھر آتی تھیں۔ جب برجن خاموش ہوئی تو ایک سماں بندھا ہوا تھا جیسے کوئی دلکش نغمہ بند ہو گیا ہو۔ سیوتی نے برجن کو گلے لگایا اور دوڑی ہوئی للو کے پاس گئی جیسے کوئی بچہ نیا کھلونا پاکر خوشی سے دوڑتا ہوا اپنے ہمجولیوں کو دکھانے جائے

للو اپنے آقائے نامدار کو عرضی لکھ رہے تھے کہ میری والدہ سخت بیمار ہو گئیں اس وجہ سے حاضر خدمت ہونے میں دیر ہوئی۔ امیدوار ہوں کہ ایک ہفتہ کی رخصت عطا فرمائی جائے۔ سیوتی کو دیکھ کر جھٹ اپنی درخواست چھپا دی اور مسکرائے، انسان کیس ابھی رہے، اپنے آپ کو دھوکہ دینے سے نہیں چوکتا۔

سیوتی: ''ذرا اندر چلو تمہیں برجن کی کوتیا سنواؤں، پھڑک اٹھو گے!''

پران ''اچھا؟ اب انہیں کویتا کا شوق ہوا ہے، ان کی بھاوج بھی تو گایا کرتی تھیں''

سیوتی: ''تم تو شیام بڑے بے خبر ہو، ذرا چل کر سنو تو، پیچھے ہنسنا، مجھے تو اس کی شاعری پر اچنبھا ہو رہا ہے''

پران: ''چلو ایک خط لکھ لوں پھر آتا ہوں''

سیوتی: ''اب یہی مجھے اچھا نہیں لگتا میں آ کے کاغذ نوچ ڈالوں گی''

سیوتی پران ناتھ کو کشاں کشاں لے آئی۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ برجن نے کوئی معمولی بھجن بنایا ہوگا۔ اسی کو سنانے کے لیے بے قرار ہو رہی ہوگی

مگر جب اندر آ کر بیٹھے اور برجن نے شرماتے ہوئے اپنی پرزور نظم پریم کی متوالی پڑھنی شروع کی تو حضرت کی آنکھیں کھل گئیں

نظم کیا تھی، دردِ دل کا دریا اور رازِ الفت کا ایک دفتر تھی۔ للو سنتے تھے اور وجد میں آ

آ کر جھومتے تھے۔ الفاظ کی ایک ایک نشست پر خیال کی ایک ایک پرواز پر بے اختیار دل سے داد نکلتی تھی۔

انہوں نے بہت سے شاعروں کے کلام دیکھے تھے مگر یہ بلند پروازی، یہ تازگی، یہ جذبہ کہیں نظر نہ آیا تھا۔ اس وقت کا سماں بندھ گیا جب طلوع آفتاب سے قبل باد نسیم لہراتی ہوئی چلتی ہے۔ کلیاں کھلتی ہیں، پھول مہکتے ہیں اور آسمان پر ہلکی سرخی چھا جاتی ہے۔ ایک ایک شعر دمیں گلہائے تازہ کی شوخی اور شبنم کی تازگی موجود تھی۔

اس پر برجن کا سریلا پن اور آواز کی گرمی نشہ پر باد صبا کا کام کر رہی تھی۔ آہ! یہ وہ اشعار تھے جن پر برجن نے دل کو شمع کی طرح جلایا تھا

للو تمسخر کی نیت سے آئے تھے مگر جب وہ اٹھے تو واقعی ایسا محسوس ہوتا تھا، گویا پہلو سے دل نکل گیا۔ ایک دن انہوں نے برجن سے کہا

''تمہارا کلام چھپے تو بہت مقبول ہو''

برجن نے سر جھکا کر کہا

''مجھے یقین نہیں کہ کوئی اس کی قدر کرے''

پران ناتھ'' ایسا ممکن ہی نہیں اگر دلوں میں کچھ بھی احساس باقی ہے تو تمہارے کلام کی ضرور قدر ہو گی، ایسے لوگ موجود ہیں جو پھولوں کی مہک سے سرشار ہو جاتے ہیں جو چڑیوں کی چہک اور چاندنی رات کے سہانے پن کا لطف اٹھا سکتے ہیں تو وہ تمہاری کویتا کو ضرور دل میں جگہ دیں گے''

برجن کے دل میں وہ گدگدی پیدا ہوئی جو ہر ایک مصنف کو اپنے فکر و سخن کی داد ملنے اور اپنے کلام کے مقبول و مطبوع ہونے کے خیال سے ہوتی ہے

تاہم وہ نہیں نہیں کرتی رہی مگر وہ نہیں ہاں کے برابر تھی۔ الہ آباد سے ان دنوں کملا نام کا اچھا رسالہ نکلتا تھا۔ پران ناتھ نے پریم کی متوالی کو وہاں بھیج دیا۔

ایڈیٹر صاحب ایک نکتہ سنج بزرگ تھے۔ دل کھول کر کلام کی داد دی اور قدر کی۔ اور

جب یہ متوالی نازنین کملا کے خوشوں میں رنگین لباس پہن کر نکلی تو لوں نے اسے دل میں بٹھایا اور آنکھوں میں جگہ دی

شاید ہی کسی شاعر کی فکر اولین کو ایسی قبولیت عام نصیب ہوئی ہو۔لوگ پڑھتے تھے اور حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتے۔سخن فہم حلقوں میں ہفتوں تک متوالی نازنین کے چرچے رہے کسی کو یقین ہی نہ آتا کہ یہ ایک گمنام شاعرہ کا کلام ہے۔فیصلہ یہی تھا کہ اس شاعرہ کو الہام ہوگیا ہے

اب ماہ بہ ماہ کملا کے صفحے برجن کے کلام سے مزین ہونے لگے،اور بھارت مہلا کا نام بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ گیا۔کوئی اخبار یا رسالہ ایسا نہ تھا جو بھارت مہلا کے کلام سے اپنے تئیں نہ سنوارتا ہو۔اخبار کھولتے ہی ناظرین کی آنکھیں بھارت مہلا کو ڈھونڈنے لگتیں۔ہاں اس کی آتش بیانیاں اب کسی کو حیرت میں نہ ڈالتیں۔اس نے خود شاعری کا معیار اونچا کر دیا تھا۔

قلم وسخن کی رانی کے لیے کمال شاعری خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو ایک لازمی امر تھا نہ کہ قابل حیرت تین سال تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ بھارت مہلا کون ہے آ کر پران ناتھ سے رہا نہ گیا۔برجن سے انہیں سخن فہمانہ عقیدت ہوگئی تھی اور وہ مہینوں سے اس کے حالات زندگی لکھنے کی فکر میں پریشان تھے۔سیوتی کے ذریعے سے رفتہ رفتہ اس کے سوانح حیات سب دریافت کر لیے بھارت مہلا کے عنوان سے ایک پرزور مضمون لکھا۔

پران ناتھ نے پہلے کبھی کوئی مضمون نہ لکھا تھا مگر فرط عقیدت نے ان کے قلم کو تیز وفصیح بنا دیا تھا۔عبارت اول سے آخر تک چست اور خیالات پاکیزہ تھے۔

اس مضمون کا شائع ہونا تھا کہ برجن کو ہر چہار طرف سے قدر دانی کے نذرانے ملنے لگے۔رادھا چرن مراد آباد سے اس کی ملاقات کو آئے،کملا امادئی سیتا چندر کنور اور کتنی ہی پرانی سکھیاں جنہوں نے یاد بھلا دی تھی،ہر روز برجن کے درشنوں کو آنے

لگیں۔ بڑے بڑے صاحب نظر رو سا جو خودداری کی شان میں حکام کے روبرو بھی سر نہ جھکاتے تھے، بر جن کے دروازے کی زیارت کو آتے تھے چندرا خودتو نہ آسکی مگر خط میں لکھا، جی چاہتا ہے کہ تمہارے پیروں پر سر رکھ کر گھنٹوں روؤں، بر جن کے دروازے پر ہر دم ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔

## 23

## امتحان

منشی سنجیون لال اور پرتاپ چند جوں ہی سوامی برہما نند جی کے روبرو پہنچے کہ انہوں نے چونک کر دیکھا۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں نور حقیقت سے ایسی لبریز تھیں جیسے گیان سرور آب مصفا سے دونوں نوواردوں نے ان کے قدم آنکھوں سے لگائے سوامی جی نے انہیں اٹھا کر چھاتی سے لگایا اور منشی جی دیر تک سفر کی باتیں پوچھتے رہے۔ بعد ازاں مسکرا کر پرتاپ کی طرف دیکھا اور فرط شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے

''تھک تو نہیں گئے''

پرتاپ چند کچھ جواب نہ دے سکا۔ اسے اس وقت وہ سرور قلب حاصل ہو رہا تھا۔ جس کا مزہ دل لیتا ہے۔ مگر زبان نہیں کہہ سکتی جس وقت وہ سوامی جی کے سینہ سے لپٹا اسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پریم کے دریائے بے پایاں میں غوطہ لگا رہا ہوں۔ اس کا دل و دماغ خودبخود کسی پر زور کشش سے کھنچا ہوا چلا جاتا تھا، جیسے کوئی کشتی لہروں کی زد میں لنگر تڑا کر بہہ جاتی ہے۔ وہی کیفیت اس کی ہو رہی تھی۔ کلیجہ تھا کہ اڈا چلا جاتا تھا، جیسے کوئی اسے حیرت ہوتی تھی کہ میری یہ حالت کیوں ہوتی جاتی ہے۔ حسن و عشق کی کشش کا اسے تجربہ ہو چکا تھا مگر اس وقت محبت کا جو پر سرور غلبہ اس کی روح پر ہو رہا تھا، وہ خیال فکر اور تمیز کے اندازے سے باہر تھا۔

مگر یہ کیفیت صرف پرتاپ ہی کی نہ تھی، منشی جی حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ

سوامی جی برہمانند جی کی پرنور آنکھیں بھی آب جو ہوگئی ہیں اوران کے روشن چہرہ پر جوسروراور عافیت کی تصویر تھا، پریشانی کے آثار نمایاں ہیں۔ یہ کیوں؟ کیا کشتی نے دریا میں ہلچل ڈال دی اور دریا بھی وہ جس کی تھاہ نہیں۔ ایسا تو کہیں ہوتے نہیں دیکھا۔

دوسرے دن سوامی جی نے بالک رام کو ویدوں کی تلقین شروع کی۔ ایسے عارف کامل کے روبروزانوئے ارادت تہہ کرنا وہ موقع تھا جس پر فرشتے بھی ناز کریں تو بجا ہے۔ جس وقت وہ زبان مبارک سے اپنے دلربا لہجہ میں وید کے رچاؤں کی تشریح کرنے لگتے تو ہوا کی چڑیاں اورکوہ بیابان کے جانوریوں آ کر جمع ہوتے گویا کسی نے ان پر جادو کر دیا ہو۔ درختوں کا جھومنا بن ہو جاتا، مانسرور کی لہریں تھم جاتیں، ساری فطرت پر ایک مدہوشی کا عالم چھا جاتا، کلام فطرت کے یہ ادنیٰ کرشمے ہیں سوامی جی کے خیالات کیلاش کی چوٹیوں سے بھی زیادہ بلند اور گیان سروور کی سطح بلوریں سے بھی زیادہ روشن تھے۔ حقائق معرفت پر جب تقریر کرتے تو معنی کا دریا بہا دیتے۔ ادب اور فلسفہ کے بادشاہ مبارک تھے۔ وہ راتیں جب سوامی جی ایک مرگ چھالے پر مانسرور کے لب آب لیتے اور ویاس اور والمیک کے پاکیزہ خیالات کی داد دیتے۔

حیرت تو یہ تھی کہ اس گنج عافیت میں وہ بھی سوامی جی علم اور تہذیب کی رفتار تازہ ترین سے آگاہ تھے اور اکثر جدید علمی انکشافات اور نظری تحقیقات پر ایسے پروزن خیالات کا اظہار کرتے کہ پرتاپ دنگ رہ جاتا۔

اس کٹی کے آستانے پر دنیا کے کتنے ہی علماء وفضلا نے جبہ سائی کی تھی اور کتنے سیاح، مدبر، فلسفی اور شاعر ہر سال اس مقام کی زیارت کو آیا کرتے تھے۔ یورپ کے مصالح ملکی کی کتنی ہی گتھیاں اسی گیان سروور کے کنارے سلجھائی گئی تھیں اور تاریخ وفلسفہ کے کتنے ہی عقدے یہاں حل ہو رہے تھے۔

پرتاپ چند کو یہاں یورپ کے بعض نامور علماء سے ملنے کا اتفاق ہوا اور بہت سی ایسی تصنیفیں دیکھنے میں آئیں جو الہ آباد کے کتب خانوں میں بھی نظر نہ آئی تھیں یہ ان زائرین کی یادگاریں تھیں جو وقتاً فوقتاً یہاں آئے تھے اور جب کبھی دنیا کے کسی حصے میں کسی صیغہ علم پر کوئی معرکے کی کتاب لکھی جاتی تو خود مصنف یا سوامی کا کوئی معتقد اسے ضرور یہاں بھیج دیا کرتا۔ وہ ایک بادشاہ تھا کہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا دور دراز کے ممالک سے علم وتحقیقات کا خراج لیا کرتا۔

مادی سلطنت ایک محدود شے ہے مگر روحانی شے بھی وسیع اور وسعت سے بھی زیادہ فراخ ہے، تخت زرکار کی، فقیری بوریئے کی ہستی کے سامنے کچھ نہیں۔ پرتاپ چند نے اپنی عقل وذہن کا دامن اس علم وہنر کے کان سے خوب آزادی کے ساتھ بھرا اور یورپ کی کئی زبانوں کا ماہر ہوگیا۔

پانچ سال گزر گئے۔

گرمی کے دن تھے، کوہ اور دریا نے گرمی سے تنگ آکر اپنے سفید لباس اتارنے شروع کردیئے تھے۔ آسمان کا نیلا پن آنکھوں میں کھبا جاتا تھا۔ چاروں طرف ہریالی پھیلی ہوئی تھی ایک روز پرتاپ چند گیان سروور کے کنارے یوگ سادھن میں مصروف تھا کہ سوامی جی نے سنجیون لال سے کہا

''میرے خیال میں بالا جی کو اب یہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں میں کئی دن سے سوچ رہا ہوں کہ انہیں رخصت کردوں مگر ان سے کچھ ایسی محبت ہوگئی ہے کہ جدائی کا خیال شاق گزرتا ہے آپ کو میری اس کمزوری پر تعجب ہوگا مگر میں آج آپ سے کہتا ہوں کہ پرتاپ چند میرا بیٹا ہے''

سنجیون لال (حیرت سے) ''ایں!''

سوامی جی ''اسی خیال سے آپ میری کمزوری معافی کے قابل سمجھیں۔ پہلے ہی جب میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی تو پرانی محبت تازہ ہوگئی اور میں ضبط و

استقلال سے کام نہ لیتا تو یقین تھا کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے اور راز افشا ہو جاتا۔ آج پورے بیس سال گزرے جب میں نے اس دنیا سے منہ موڑا تھا۔ اس وقت کی تصویر آج بھی میری نگاہوں میں ہے۔ جب میں شام کے وقت رخصت ہوا تھا پرتاپ چھ سال کا بھی نہ ہوا تھا، وہ بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا تھا اور ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا''

مگر پرماتما کے سوا اور کون جان سکتا تھا کہ اسے اپنے خیال سے دور رکھنے کے لیے کتنے ضبط اور ترک سے کام لیا۔ برسوں تک ہر دم اس کی موہنی صورت آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی تھی۔ بارے ایشور کی دیا سے میں نفس پر غالب ہوا۔ اور اٹھارہ برسوں تک پرتاپ ایک لمحے کے لیے میرے دھیان میں نہیں آیا۔ مگر جوں ہی آپ کے ساتھ دیکھا تو پرانی یاد تازہ ہو گئی۔

مجھے اپنے بیراگ پر گھمنڈ تھا کہ اب مایا کا میرے دل میں گزر نہیں ہو سکتا۔ مگر بالا جی نے میرا یہ گھمنڈ چور چور کر دیا۔ میں اتنے دنوں کے یوگ سادھن کے بعد بھی ایک کمزور انسان ہوں یہ تعلق محض جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہوتا ہے اور یوگ تپ بیراگ کوئی بھی تعلق کو توڑ نہیں سکتا۔

سنجیون لال ''مہاراج! آپ نے جو کچھ کر دکھایا وہ بھی معجزے سے کم نہیں سباما جیسی دیوی پرتاپ چند جیسا بیٹا ہر شخص نہیں تیاگ سکتا''

سوامی جی: ''متر یہ سب ایشور کی رچنا تھی۔ مجھے شروع ہی سے اپنے بھائیوں کی بھلائی کا خیال پیدا ہو گیا تھا اور جو کچھ میرے کیے ہو سکتا تھا اس سے ان کی خدمت کرتا رہتا تھا۔ مگر یہ دلی آرزو تھی کہ ایشور میرے گھر میں کوئی قوم کا فدائی پیدا کرتا۔ میں ایشور سے ہمیشہ یہی پرارتھنا کیا کرتا آخر لکشمی جی نے سباما کو درشن دیئے اور سباما نے مہارانی سے منہ مانگا وردان پایا۔ اسی رات مجھے بھی بیراگ کا سندیسہ ملا''

سنجیون لال: ''ایشور کی لیلا اپار ہے اگر مہاراج بیراگ نہ پاتے تو بالا جی آج کس

کی شرن لیتے''

سوامی جی: ''بالا جی ابھی تہہ پر نہیں پہنچے ہیں اور نہ میں انہیں جتانا مناسب سمجھتا ہوں ورنہ وہ یہاں سے جانا ہرگز منظور نہ کریں گے۔ دیکھیے اس تھوڑی سی مدت میں انہوں نے کیسا حیرت انگیز کام کیا ہے۔ اس سن میں ایسا ضبط اور یوگ میں نے نہیں دیکھا۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایسے بیٹے کا باپ ہوں''

سنجیون لال: ''پچھلے دنوں کونٹ پنڈ لشام سے انہوں نے راج نیت پر جو مباحثہ کیا اسے سن کر میں حیرت میں آ گیا''

سوامی جی: ''یہ کونٹ علماء میں سر آمد روزگار سمجھے جاتے ہیں''

**سنجیون لال:** ''مجھے لنکا میں ایک بار ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا''

سوامی جی: خیر علم تو ایک ایسی چیز ہے جو شوق و شغفت سے روز بروز ترقی پا سکتا ہے مگر اس وقت بالا جی کو ہمیشہ کے لیے رخصت کرنے سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کے دل میں کمزوری تو باقی نہیں ہے۔

مجھے یہ تجربہ ہے کہ بعض آدمی مدت تک بیراگ میں رہنے کے بعد یکا یک ناگفتہ بہ کمزوریاں کر بیٹھتے ہیں۔ خصوصاً اس براگی کے لیے جو اس دنیا میں رہ کر اس سے الگ رہنے کا حوصلہ رکھتا ہو، انتہا درجہ کے مضبوط دل کی ضرورت ہے۔ ہم اور آپ اس کنج خلوت میں بیٹھے ہوئے دنیا کی گمراہیوں اور لغزشوں سے بچے رہ سکتے ہیں مگر پانی پر کنول بن جاتا اس بدرجہا مشکل بات ہے

سنجیون لال: ''مجھے یقین کامل ہے کہ کوئی دنیاوی طاقت بالا جی کو فرض اور حق کے راستہ سے نہیں پھیر سکتی''

سوامی جی: ''خیال تو میرا بھی ایسا ہی ہے مگر یقین جب ہی ہو سکتا ہے جب ایک بار انہیں آزما لوں۔ میں یہ آزما کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کا ضبط اور ترک ارادی ہے یا طبیعت ثانی ہو قوم کی خدمت پہلے تو ایک تپسیا معلوم ہوتی ہے۔ مگر دنوں کے ساتھ نا

خدائے قوم کا ظاہری اعزاز و اقتدار بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے روبرو بادشاہوں کی گردنیں بھی جھک جاتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ جو آنکھیں شمشیر برہنہ کے ساتھ کبھی نہیں جھپکیں وہ مئے گلفام کے ایک پیالہ سے سرشار ہو گئی ہیں اور جو دل سختیوں اور آفتوں کے طوفان سے بھی نہیں ڈرے، وہ مدارات و عنایات کی خوشگوار تھپکیوں میں نہ سنبھل سکے‘‘

سنجیون لال: ’’اس کا امتحان کیونکر ہو گا؟‘‘

سوامی جی: ’’ہم اور آپ مل کر بالا جی کے نفس پر زور ڈالیں گے۔ آپ کو اس لیے شریک کرنا چاہتا ہوں کہ میں تنہا غالباً ان کی آتما پر کچھ اثر نہیں پہنچا سکوں گا۔ ان کی یوگ شکتی ان دنوں بہت بڑھی ہوئی ہے‘‘

پرتاپ چندر گیان سرور کے کنارے اپنے خیال میں مگن بیٹھا ہوا تھا کہ اسے کچھ غنودگی سی معلوم ہوئی اور جمائیاں آنے لگیں۔ مگر اس نے چونک کر آنکھیں نہ ملیں اور اپنے خیالوں میں مگن ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اس پر غنودگی کا غلبہ ہوا اور آنکھیں جھپکنے لگیں جیسے کوئی رات بھر کا جاگا ہوا آدمی صبح کے وقت نیند سے متوالا ہو جائے۔ پرتاپ کو تعجب ہوا کہ آج مجھے اتنی نیند آ رہی ہے۔ اس نے پانی کے چھینٹے منہ پر دیئے اور دل میں مضبوط ارادہ کر لیا کہ اب نیند کو ہرگز نہ آنے دوں گا۔ لیکن آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا کہ پھر وہی کیفیت ہوئی۔ آنکھیں خواب گراں سے مخمور ہو کر مندنے لگیں اور انگڑائیوں کے مارے اعضاء ٹوٹنے لگے۔ پرتاپ کی سمجھ میں نہ آیا کہ میری یہ حالت کیوں ہو رہی ہے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ دیر تک تیزی سے چلتا رہا۔ بعد ازاں اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

اس طرح نیند نے اس پر چھ نا کام حملے کیے۔ ایک اور ایک پر زور مگر ساتواں حملہ پرتاپ سے برداشت نہ ہو سکا۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور گردن جھک گئی اس کی آتما اب کی بار مغلوب ہو گئی۔

مدہوشی کا غلبہ ہوتے ہی پرتاپ چند کو ایسا معلوم ہوا کہ میں کسی پر فضا باغ میں آ گیا ہوں عنبر ریز ہوائیں چل رہی ہیں اور ہر ایک درخت پر خوش رنگ اور شیریں نوا چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں ہوا میں کچھ ایسی فرحت ہے طیور کی شیریں نوائیوں میں وہ مستانہ پن اور مہک میں وہ نشہ ہے کہ دل و دماغ متوالے ہوئے جا رہے ہیں۔

بہار اپنی دل فریبیوں کے پورے سامان لے کر آ پہنچی ہے۔ پرتاپ متحیر تھا کہ میں اس جنت کدے میں کیونکر آ پہنچا ہوں۔ ابھی تو میں گیان سرور کے کنارے بیٹھا ہوا تھا کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں یہ سوچ کر اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور پختہ یقین کر لیا کہ یہ خواب نہیں ہے میں ضرور بھٹک کر کسی کے باغیچہ میں چلا آیا۔

وہ ادھر ادھر روشوں میں ٹہلنے لگا کہ دفعتاً ایک نازنین سایہ دار درختوں کی آڑ سے خراماں خراماں آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس پر حسن کا روپ تھا اور نزاکت کا سنگھار وہ روشنی کی ایک تصویر معلوم ہوتی تھی۔ پرتاپ چند کو دیکھتے ہی وہ ٹھٹکی اور چشم پرنم سے دیکھ کر بولی ''پرتاپ''

پرتاپ چند نے اسے پہچان لیا

وہ برج رانی تھی مگر اس آب و گل کی برج رانی سے بدرجہا بہتر اور حسین ہے۔ متحیر ہو کر بولا ''برجن! تم یہاں کہاں؟''

برج رانی: ''جہاں تم ہو وہاں میں بھی ہوں محبت نے تمہارا پتہ دیا، اگر تم مہک بن کر پھولوں میں سما جاتے تو بھی میں تمہیں ڈھونڈ نکالتی، تمہیں شاید معلوم نہیں میں نے دوسرا جنم لیا ہے''

پرتاپ: ''(حیرت سے) دوسرا جنم!''

برج رانی: ''ہاں اب کی بار میرا جنم دیولوک میں ہوا ہے مگر جب سے ہوش سنبھالا ہے تمہارے بیوگ میں گھل رہی ہوں۔ یہ میرے باپ کا باغ ہے تمہارا استھان یہاں سے بہت قریب ہے۔ تمہیں معلوم نہیں مگر میں دن میں کئی بار تمہارے درشن

کرتی رہی ہوں۔ میرے بھاگ اچھے تھے کہ میں نے اس لوک میں جنم لیا ہے۔ ایشور نے شاید میری آرزوئیں پوری کرنے کے لیے تمہاری پہلو میں بھیجا ہے"

پرتاپ چند: "برجن! ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو کیا تم کو نہیں معلوم کہ میرا تم سے ہمیشہ سے پاک تعلق رہا ہے"

برج رانی: "پیارے! ان خیالوں سے میرے ابھاگے دل کو تسکین نہیں ہوتی۔ پریم کی آگ نے ان سب خیالات کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ میں نے خیال کیا تھا کہ تم نظروں سے دور ہو جاؤ گے تو دل تمہیں بھول جائے گا میں نے دل کو بہت سمجھایا، مدتوں سے شعر و سخن سے جی بہلاتی رہی۔ تم آج بھی لوگوں کو میرے کلام کا مداح پاؤ گے۔ میں نے شہرت، عزت اور دولت سب پائی اور سب سے جی سیر ہو گیا۔ مگر تمہاری محبت کا نقش دل سے نہ مٹا۔ دوسرا جنم لے کر بھی اس آرزو میں گھلتی رہی۔ میں برسوں سے یہی سوچ رہی ہوں کہ تمہیں اپنی داستان غم سناؤں یا نہ سناؤں۔ کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر محبت میں روحانی طاقت ہے تو تم اور ہم ضرور ملیں گے۔ کبھی سوچتی تھی کہ تم مجھے بھول گئے ہوگے۔ مگر دل کو کسی طرح نہ سمجھا سکی۔ آج مجبور ہو کر میں نے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھا اور تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔ تم میرے لیے جو مناسب سمجھو وہ کرو۔ میں تمہاری ہوں، خواہ مجھے اپنے پہلو میں جگہ دو، خواہ خیال میں بھی نہ لاؤ، میں تمہاری سیوا میں رہ کر تمہارے ساتھ رہ کر سب کچھ سہنے کو تیار ہوں۔ میرے پتا جی اس لوک کے راجہ ہیں، میرے سوا ان کے کوئی اولاد نہیں۔ مگر میں سب تیاگ دوں گی۔ میں تمہارے ساتھ فاقے کروں گی، کنوئیں سے پانی کھینچوں گی"

یہ کہتے کہتے برجن کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور گلا رندھ گیا

پرتاپ چند عجیب مخمصے میں مبتلا تھا۔ برجن نے اس کی محبت کا راگ گایا تھا اور یہ راگ سن کر کون مرد ہے جو مدہوش نہ ہو جائے

وہ ذرا دیر کے لیے بالکل بے کیف ہو گیا۔ سوچنے لگا آہ کیسی سچی محبت ہے، کیسی غیر فانی، کیسی پاکیزہ اور کیسی بے غرض، برجن تو سچ مچ دیوی ہے، تب انسانوں کی دیوی تھی اب دیوتاؤں کی دیوی ہے۔ تو میرے لیے یہ بہشت اور دولت اور یہ سکھ تیاگ دے گی۔ میں کیسے تیری اس محبت کی داد دوں کہ میں ان قربانیاں کے لائق نہیں ہوں۔

پرتاپ چند انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ اتنے میں برجن نے نزاکت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "پیارے میں نے تم پر فیصلہ چھوڑ دیا ہے مگر دل کانپ رہا ہے کہ کہیں بے انصافی نہ کر بیٹھو (ہاتھ جوڑ کر) ایسا نہ کرنا! نہیں تو تمہاری برجن مر جائے گی۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی میں تم سے محبت نہیں مانگتی تمہارا دل نہیں مانگتی میں تم سے صرف تمہارے ساتھ رہنے کی، تمہاری خدمت کرنے کی اجازت چاہتی ہوں، اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں مانگتی۔ تمہارا دل میرے مان کا نہیں۔ اسے لینے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میری محبت پر غرض ہے۔ حسن و شباب چند روزہ اور دولت فانی، تمہاری محبت غیر محدود ہے"

پرتاپ چند کے جی میں آیا کہ اس دیوی کے قدموں میں سر رکھ دوں۔ وہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ برجن کی روحانی عظمت نے اسے بالکل پست کر دیا۔ قریب تھا، کہ اس خود فراموشی کے عالم میں اپنا برت بھول جائے کہ یکا یک سوامی برہمانند جی کا یہ قول یاد آیا۔

"ہر نیک اور اعلیٰ کام کے راستے میں بڑے بڑے سخت امتحانات کا سامنا ہوتا ہے۔ وہی پورا مرد ہے جو ان امتحانات سے بے داغ نکل جائے۔ بسا اوقات یہ امتحانات رنگ و روپ بدل کر آتے ہیں اس وقت ان سے مقابلہ کرنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے"

اس خیال کے آتے ہی پرتاپ کا خیال کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ ضرور میں اس

وقت امتحان میں پڑا ہوا ہوں۔ وہی طاقت جو مجھے یونہی پرکھ رہی ہے۔ برجن کی زبان اور دل پر بھی اپنا جادو چلا رہی ہے۔ یہ خیال کرتے ہوئے اس نے جواب دیا ”برجن مجھ میں یہ بیان کرنے کی طاقت نہیں کہ اس وقت تم سے مل کر طبیعت کیسی خوش ہوئی مجھے فخر ہے کہ تم جیسی پاکیزہ اور صاف دیوی مجھ سے محبت رکھتی ہے اس محبت کے مقابلہ میں میری ہستی کی کچھ وقعت نہیں۔ کاش میں اس اہل ہوتا کہ اس اتھاہ پریم کی قدر کر سکتا۔ مجھ جیسا مٹی کا انسان تمہارے لائق نہیں۔ میں تمہاری پرستش کر سکتا ہوں۔ مگر محبت نہیں میں تمہارے قدموں کی خاک پیشانی پر مل سکتا ہوں مگر تمہاری پاکیزہ محبت کو اپنی بشریت سے آلودہ نہیں کر سکتا“

برج رانی کی آنکھوں سے آنسو کا دریا بہہ نکلا ذرا دیر کے بعد بولی ”تمہارا فیصلہ مجھے بسر و چشم منظور ہے۔ ایشور تمہیں سرسبز کرے۔ یہی میری دعا ہے، میرے لیے یہی خوشی کافی ہے کہ میری عزت اور محبت تمہاری دل میں موجود ہے۔ پرتاپ یقین مانو، میں صدق دلی سے اپنی خودغرضی پر نادم ہوں۔ محبت انسان کو خودغرض بنا دیتی ہے۔ یہ اس کا تقاضا ہے حالانکہ میں محبت کی طالب نہیں تھی میری یہ خواہش نہیں تھی کہ تمہاری محبت سے بہار زندگی لوٹوں۔ خیر نوشتہ تقدیر سے کیا چارہ! میری آخری التجا یہ ہے کہ اب میری یاد اپنے دل سے نکال ڈالنا۔ ایسا نہ ہو کہ کسی وقت میری یاد تمہیں ستائے اور رلائے۔ ہائے! تم رو رہے ہو۔ پیارے رو ؤ مت! ایشور کے لیے اپنے اوپر ایسا ظلم نہ کرو۔ ورنہ پچھتاؤ گے، تمہیں تجربہ ہو جائے گا کہ قوم کی خدمت اور محبت دل کے لیے کافی غذا نہیں ہے، تمہیں سب کچھ ملے گا۔ مگر برجن نہ ملے گی۔ مجھے پرماتما نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔ اسے کیا جواب دو گے“

پرتاپ نے روتے ہوئے جواب دیا ”برجن تمہاری تگیا مت توڑو تمہارے روبرو یوں کھڑا رہ کر میں اپنی پرتگیا پر قائم نہیں رہ سکتا۔ مجھے اب رخصت کر دو۔ میں جب تک زندہ رہوں گا۔ تمہاری یاد میرے دل سے نہیں نکل سکتی“

یہ کہتے کہتے وفورِ اشک سے اس کی زبان بند ہوگئی جب گھری خوب کھول جاتا ہے تو اس کا کھولنا اور بولنا بند ہو جاتا ہے۔ برج نے سر جھکا کر اسے پرنام کیا اور نظروں سے غائب ہوگئی۔

شام کا وقت تھا ہماچل سر پر سنہرا تاج رکھے کھڑا تھا۔ چڑیاں بسیرا لے رہی تھیں آسمان سے دو ایک شوخ ستارے گھورنے لگے تھے۔ پرتاپ چند نے دیکھا کہ برجن گیان سروور کے نیلگوں پانی میں کھڑی ہے۔ گویا جل دیوی اپنے سنگھاسن پر رونق افروز ہے اور ایسی آواز سے جس میں کوئل کی کوک، پپیہے کی ہوک اور شیاما کی چہک ملی ہوئی ہے یہ دل سوز نغمہ الاپ رہی ہے۔

بن ہری کیوں راکھیں من دھیر
گھر آنگن نہ سہات رین دن بسیرے بھوجن نیر
بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

مچھلیاں روتی تھیں اور پیڑ پتے سر دھنتے تھے۔ برجن کمر تک پانی میں چلی گئی اور پھر یہ آواز آئی۔

پن پن دہی سرت آوت، چت چیوت، جمنا نیر
بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

برجن نے پرتاپ چند کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے۔ پھر گلے تک پانی میں چلی گئی۔ ایک کمل کھل گیا اور یہ آواز آئی

من ابجس آنہو سو اپنے کٹھن مدن کی پیر
بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

چند تارے کان لگائے سن رہے تھے۔ آسمان کی سرخی مٹ چکی تھی۔ برجن نے پرتاپ چند کو پرنام کیا اور پانی میں غوطہ لگایا۔ پورنماشی کا چاند دیکھتے دیکھتے ڈوب گیا۔ پرتاپ دوڑا۔ پیر لڑکھڑائے اور بے ہوش ہوگیا۔

24

## گنگا جمنا کا میلاپ

ہمارے ناظرین مادھوی کے نام سے غیر مانوس نہ ہوں گے جس طرح ایک سنگریزہ کسی پر فنکار کاریگر کے ہاتھوں میں موتیوں کے تول بکنے کے قابل ہو جاتا ہے، اسی طرح برج رانی نے مادھوی کو سکھا پڑھا کر اپنے ہی جیسا بنا لیا تھا۔ اس کی خوش خلقی، نیک مزاجی اور شرافت کی دو ایک مثالیں برجن کے ان خطوط میں ملتی ہیں جو اس نے مجگاؤں سے کملا چرن مرحوم کے نام لکھے تھے۔ کبھی کبھی جنگلی پھولوں میں وہ باس بو اور رنگ روپ مل جاتا ہے جو سجی ہوئی روشوں اور مرصع کیاریوں کو بھی نصیب نہیں ہو سکتا مادھوی تھی تو ایک غریب جاہل برہمن کی لڑکی۔ مگر فطرت نے اسے جنس حسنہ کے کل پاکیزہ اوصاف عطا کیے تھے اور اس میں تعلیم و تربیت قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ مادھوی اور برجن کا ملاپ اس وقت ہوا جب سسرال آئی اس بھولی بھالی لڑکی نے اسی وقت سے برجن کے ساتھ غیر معمولی محبت ظاہر کرنا شروع کی۔ معلوم نہیں اسے دیوی سمجھتی تھی یا کیا۔ مگر کبھی اس نے برجن کی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی نہ نکالا۔

برجن بھی اسے اپنے ساتھ سلاتی، کھلاتی اور پلاتی، اچھے اچھے ریشمی کپڑے پہناتی، اس سے زیادہ محبت وہ اپنی چھوٹی بہن سے بھی نہیں کر سکتی تھی۔

دل کو دل سے لگاؤ ہوتا ہے برجن کو سسرال میں آنے سے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ میں ہی پرتاپ چندر کے خوابوں کی پری ہوں۔ اس کی ایک ایک نظر، ایک ایک بات میں وہ اپنی محبت کی جھلک دیکھتی اور افسوس کرتی۔ ایک روز جب کہ وہ کملا چرن کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے یہ خیال کر کے رونا آ گیا تھا کہ میری تو یوں لطف سے گزرتی ہے، بیچارے پرتاپ کے دل میں نہ جانے کیا بیت رہی ہوگی۔ مادھوی اس وقت گیارہویں سال میں تھی اور اس کے رنگ و روپ کا نکھار، سلیقہ، گفتگو اور گن

دیکھ کر سب کو حیرت ہوتی تھی۔ برجن کو معاً خیال آیا کہ مادھوی اس قابل نہیں کہ پرتاپ اسے اپنے گلے کا ہار بنالیں۔ اس دن سے وہ مادھوی کی تربیت اور خاطر داری میں اور بھی زیادہ منہمک ہوگئی۔ وہ سوچ سوچ کر دل میں پھولی نہ سماتی کہ جب مینا سولہ سترہ سال کی ہو جائے گی۔ اس وقت میں پرتاپ کے پاس جاؤں گی اور اس سے ہاتھ جوڑ کر کہوں گی کہ مادھوری میری بہن ہے۔ اسے آج سے اپنی چیری سمجھو۔ کیا پرتاپ میری اس بات کو ٹال دیں گے؟ نہیں ایسا وہ نہیں کر سکتے۔ مزہ تو تب ہے کہ خود مادھوی کو پچی اپنا بنانے کی مجھ سے استدعا کریں۔ اسی خیال سے برجن نے پرتاپ چند کے اوصاف حمیدہ کا نقش مادھوی کے دل میں جمانا شروع کر دیا تھا کہ اس کا رواں رواں پرتاپ کی محبت میں سرشار ہو جائے۔ جب وہ پرتاپ چند کا بکھان کرنے لگتی تو خود بخود اس کے الفاظ غیر معمولی طور پر شیریں اور فصیح ہو جاتے۔ رفتہ رفتہ مادھوی کا بچہ دل چاشنی الفت کے مزے لینے لگا۔ آئینہ میں بال پڑ گیا۔

بھولی مادھوی سوچنے لگی میں کیسی خوش قسمت ہوں مجھے ایسا سوامی ملے گا۔ جس کے پیر دھونے کے لائق بھی میں نہیں ہوں مگر کیا وہ مجھے اپنی چیری بنائیں گے۔ کچھ ہو، میں ضرور ان کی بنوں گی اور پریم میں کچھ کھچاؤ ہے تو بھی میں انہیں ضرور اپنالوں گی۔ مگر اس غریب کو کیا معلوم تھا کہ یہ آرزوئیں حسرت بن کر آنکھوں کے راستہ بہہ جائیں گے۔ اس کا پندرھواں سال پورا ابھی نہ ہوا تھا کہ برجن پر خانہ تباہی کے صدمے آپڑے۔ اس طوفان نے جو کسر رکھ چوڑی تھی۔ وہ اس آگ نے جلا کر راکھ کر دی۔

مگر خیال کوئی چیز ہے تو مادھوی پرتاپ چند کی بیوی بن چکی۔ اس نے اپنا تن اور من انہیں سونپ دیا۔ پرتاپ کو خبر نہیں مگر آج اسے ایسی بیش بہا چیز ملی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ٹھہری سکتی۔ مادھوی نے صرف ایک بار پرتاپ کو دیکھا اور

صرف ایک بار اس کی امرت کی سی باتیں سنیں تھیں۔ مگر برجن کی شیریں بیانیوں نے اس کے سینہ میں آگ کی وہ چنگاری ڈال دی تھی جو روئی کے تودے میں گھس کر اسے جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ پرتاپ کا پتہ نہیں ہے مگر مادھوری اس کی پر زور محبت میں روز بروز گھلتی جاتی ہے۔ اس دن سے کوئی ایسا برت نہیں تھا جو مادھوی نہ رکھتی کوئی ایسا دیوتا نہیں تھا جس کی وہ پوجا نہ کرتی ہو اور یہ سب اس لیے کہ پرتاپ کو ایشور جہاں کہیں بھی ہو، خیریت سے رکھے۔ ان خیالات نے اس لڑکی کو اور بھی زیادہ متین، نیک مزاج اور شریف بنا دیا۔ شاید اس کے دل نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میرا بیاہ پرتاپ چند سے ہو چکا۔ برجن اس کی یہ حالت دیکھتی اور روتی کہ یہ آگ میری ہی لگائی ہے۔ اب یہ گل نورس کس کے گلے کا ہار بنے گا۔ وہ کس کی ہو کر رہے گی ہائے! جس بیج کو میں نے اتنی محنتوں سے اگایا اور شہد اور دودھ سے سینچا۔ اس کا پھول شاخ پر کملا جاتا ہے! برجن تو خیر شعر وسخن میں الجھی رہتی۔ یہی باغیچہ اس کا ہمدم اور خیال یار تھا۔ اس کا یار جواب تک اس کے لیے بیگانہ محض تھا ایک روز پرتاپ کے چلے جانے کے بعد خواب دیکھا کہ وہ سنیاسی ہو گیا ہے۔ آج مادھوی کا اتھاہ پریم ظاہر ہوا۔ اسے الہام سا ہو گیا کہ پرتاپ نے ضرور سنیاس لے لیا آج سے وہ تپسونی بن گئی۔ ذاتی آرام و آرائش کا خیال دل سے جاتا رہا۔

جب کبھی بیٹھے بیٹھے مادھوی کا جی گھبراتا تو وہ پرتاپ چند کے گھر جا بیٹھتی۔ وہاں اس کے دل کو ذرا تسکین ہو جاتی تھی۔ جب سے سباما کو برجن کے خطوط کا بیاض ملا تھا۔ اس کی زندگی نے عجیب روش اختیار کر لی تھی۔ غرور حسنہ اس کے اوصاف کا خاص رکن تھا۔ اس نے اپنی پیشانی پر بل تک نہ آنے دیا تھا۔ زبان سے افسوس و ملال کا ایک لفظ نہ آنے دیا تھا اور آنکھوں سے حسرت کے آنسو بہنے پائے۔ حسب معمول ٹھیکہ کا کاروبار کرتی رہی بلکہ اب اور بھی مصروفیت اور انہماک کے ساتھ ہاں اب بجائے بخیلانہ کنایت شعاری کے مزاج میں فراخدلی آ گئی تھی یہ مکان، مادھوی

کے لیے ایک پاک مندر تھا۔ جب تک برجن اور سباما کے دلوں میں گانٹھ پڑی ہوئی تھی وہ یہاں بہت کم آتی تھی۔

مگر جب آخر کار برجن کی پاکیزہ شاعری، پاکیزہ خیالات اور پاکیزہ طرز زندگی نے دونوں عورتوں کے دلوں کی گانٹھ کھول دی اور وہ گنگا جمنا کی طرح باہم گلے مل گئیں تو مادھوری کی آمدورفت بھی بڑھ گئی۔ سباما کے پاس دن کے دن بیٹھی رہ جاتی۔ اس گھر کی ایک ایک انگل زمین پرتاپ چند کی یادگار تھی۔ اسی آنگن میں بالا جی نے کاٹھ کے گھوڑے دوڑائے تھے اور اسی حوض میں کاغذ کی ناویں چلائی تھیں۔ ناویں تو شاید زمانہ کے بھنور میں پڑ کر ڈوب گئیں۔ مگر گھوڑا اب بھی موجود تھا۔ مینا نے اس کی بوسیدہ ہڈیوں میں جان ڈال دی اور اسے باغیچہ میں حوض کے کنارے ایک گلاب کے سایہ میں باندھ دیا۔ یہی کمرہ بالا جی کی آرام گاہ تھا۔ مادھوی اسے اب اپنے دیوتا کا مندر سمجھتی تھی۔ اسی پلنگ نے بالا جی کو مدتوں تک اپنی آغوش میں تھپک تھپک کر سلایا تھا مادھوی اسے اب پھولوں سے سجاتی تھی۔ کیا پلنگ نے ایسے دن بھی دیکھے تھے۔ مادھوی کی اس ہمہ گیر محبت سے سباما کا کفر ٹوٹ گیا۔ مدت سے اس کی زبان پر پرتاپ کا کبھی نام نہیں آیا تھا۔ برجن سے میل جول بھی ہو گیا۔ مگر دونوں عورتوں میں پرتاپ کا ذکر کبھی نہیں آیا تھا۔

حیا برجن کی دامن گیر تھی اور خودداری سباما کی، مگر مادھوی کے شعلہ محبت نے پتھر کو بھی پگھلا دیا تھا جب وہ خود رفتگی کے عالم میں پرتاپ کے بچپنے کی باتیں پوچھنے لگتی تو سباما سے ضبط نہ ہوتا۔ اس کی آنکھیں بھر آتیں۔ تب وہ دونوں کی دونوں راتیں روتیں اور دن بھر ان کی باتیں ختم نہ ہوتیں۔ کیا اب بھی مادھوی کا حال دل سباما سے چھپ سکتا تھا۔ وہ اکثر سوچتی کہ کیا یہ چسونی یوں ہی محبت کی آگ میں جلتی رہے گی اور بنا کسی امید کے!

آٹھ نو سال بیت گئے۔ ایک روز برج رانی نے کملا کا پیکٹ کھولا تو سرورق پر ایک

نہایت پر جلال تصویر کئی رنگوں میں بنی ہوئی نظر آئی یہ کسی مہاتما کی تصویر تھی۔ اسے خیال آیا کہ میں ان ان مہاتما کو کہیں ضرور دیکھا ہے سوچتے سوچتے یکا یک اس کا خیال پرتاپ چند تک جا پہنچا۔ فرط مسرت سے اچھل پڑی اور بولی۔ ''مادھوی ذرا یہاں آجاؤ''

مادھوی پھولوں کی کیاریاں سینچ رہی تھی۔ اس کے دل کے بہلاؤ کا آج کل یہی مشغلہ تھا۔ ساڑھی پانی میں لت پت، سر پر بال بکھیرے، ماتھے پر پسینہ کی بوندیں اور آنکھوں میں پریم کا رس، آ کر کھڑی ہو گئی۔ برجن نے کہا '' آ تجھے ایک تصویر دکھاؤں''

مادھوی: ''کس کی تصویر ہے دیکھوں''

مادھوی نے تصویر کو بغور دیکھا اور آبدیدہ ہوگئی۔

برجن: ''پہچان گئی''

مادھوی: ''کیوں؟ یہ شکل میں کئی بار خواب میں دیکھ چکی ہوں، چہرے سے تیج برس رہا ہے''

برجن: ''دیکھو کچھ حالات بھی لکھے ہیں''

مادھوی نے دوسرا ورق الٹا ''سوامی بالا جی'' کی سرخی نظر آئی

تھوڑی دیر کے لیے دونوں کی دونوں خاموش اور محویت کی تصویر بنی ہوئی یہ مضمون پڑھتی رہیں۔ بعد ازاں بات چیت ہونے لگے۔

برجن: ''میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ انہوں نے ضرور سنیاس لے لیا ہوگیا''

مادھوی زمین کی طرف تاکتی رہی مگر منہ سے کچھ نہ بولی

برجن: ''تب اور اب میں کتنا فرق ہے؟ چہرہ پر جلال برس رہا ہے تب ایسے وجیہ نہ تھے''

مادھوی: ''ہوں''

برجن: ''ایشور ان کی مدد کرے، بڑی تپسیا کی ہے (آبدیدہ ہوکر) کیا اتفاقات ہیں، ہم اور وہ ساتھ کھیلے، آج وہ سنیاسی ہیں اور میں بیراگن، نہ جانے انہیں ہم لوگوں کی سدھ بھی ہے یا نہیں۔ جس نے سنیاس لے لیا، اسے کسی سے کیا ناطہ، جب چچی کے پاس ایک خط نہ لکھا تو بھلا ہمارکیا یاد باقی ہوگی مادھوی! بچپنے میں وہ کبھی جوگی جوگی کھیلتے تو میں مٹھائیوں کی بھکشا دیا کرتی تھی''

مادھوی نے روکر کہا ''نہ جانے کب درش ہوں گے'' یہ کہہ کر شرم سے سر جھکا لیا

برجن: ''جلد آئیں گے، راجہ دھرم سنگھ اور بھیا دونوں انہیں ضرور لائیں گے''

مادھوی: ''ان دونوں نے بڑے حوصلے کا کام کیا ہے''

برجن: ''کیسا کچھ! راجہ صاحب یہاں سے سیر کرنے گئے تھے۔ شاید خطاب کی آرزو کھینچ کر لے گئی تھی۔ ان کی جائیداد دو کروڑ سے کم نہیں۔ پچاس لاکھ تو سالانہ نفع ہے۔ ان کا اس فراخدلی سے ساری جائیداد کارتو قف کار خیر میں وقف کر دینا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بھی ارپن کر دینا بڑا بھاری تیاگ ہے۔ بھیا نے بھی کل کا نام روشن کر دیا۔ مجھے ان کی طرف سے ایسی امید نہ تھی''

مادھوی: ''چندرا بہن آتی ہوں گی''

برجن: ''ہاں اب وہاں کیا کریں گی، انہیں بھیا کا کام شاید ہی پسند نہ آیا ہو، جلاتی ہوئی آتی ہوں گی''

مادھوی: ''درشنوں کو لوگ بہت بہت دور سے آئے تھے''

برجن: ''تقریر کی کیسی تعریف کی ہے، ان کی زبان میں تو پہلے ہی جادو تھا۔ اب کیا پوچھنا بھیا کی تقریر کا جس کے دل پر ایسا اثر ہو وہ ساری دنیا پر اپنا جادو پھیلا سکتا ہے''

مادھوی: ''چلو چچی کے یہاں چلیں''

برجن: ''ہاں ان کا تو خیال ہی نہیں، دیکھیں کیا کہتی ہیں، خوش تو کیا ہوں گی''

مادھوی: ''ان کی تو بھلا بھلا کہا ہی یہ تھی، خوش کیوں نہ ہوں گی''

برجن: ”چل ماں یہ خبر سن کر بھی خوش ہو سکتی“

دونوں عورتیں گھر سے باہر نکلیں۔ دونوں حسن کی رانیاں تھیں۔ برجن کو دیکھ کر اکثر آدمی سر تعظیم خم کرتے تھے۔ لوگ فرط ادب سے اس کے سامنے سے ہٹ جاتے۔ خاص و عام میں اس کی یکساں عزت تھی۔ کوئی مادھوی سے پوچھے تیرے پیر اب زمین پر کیوں نہیں پڑتے۔ تیرے زرد چہرے پر کیوں مسرت کی سرخی جھلکا کرتی ہے۔ تجھے کونسی دولت مل گئی ہے۔ تو اب متفکر اور مغموم نظر نہیں آتی۔ تجھے اپنے چتیم سے ملنے کی اب کوئی امید نہیں۔ تجھ پر محبت کی نگاہیں کبھی نہیں پڑیں۔ تیرے کانوں میں محبت کی آوازیں کبھی نہیں پڑیں۔ پھر تو کیوں پھولی نہیں سماتی۔ اس کا جواب مادھوی کیا دے گی۔ کچھ نہیں، وہ سر جھکا لیتی اور اس کی آنکھیں نیچے جھک جائیں گی جیسے پھولوں کے بوجھ سے شاخیں نیچے جھک جاتی ہیں اور شاید آنسو کے چند قطرے ٹپک پڑیں۔ مگر اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلے گا۔

مادھوی محبت کے نشہ سے متوالی ہے۔ اس کا دل دیوانہ محبت ہے۔ اس کی محبت بازار کا سودا نہیں، اس کا پریم کسی چیز کا بھوکا نہیں۔ وہ محبت کے عوض نہیں چاہتی۔ اسے ناز ہے کہ ایسے پاک منش آدمی کی صورت میرے دل میں جلوہ گزیں ہے اور یہی اس کی دیوانگی، اس کے پریم اور اس کے عشق کا صلہ ہے۔

دوسرے مہینے میں برج رانی نے بالاجی کے خیر مقدم میں ایک پرزور نظم لکھی۔ یہ شاعرانہ معجزہ تھا۔ جب یہ نظم شائع ہوئی تو علمی دنیا باوجود برجن کی روز افزوں بلند پروازیوں سے مانوس ہونے کے حیرت میں آ گئی۔ وہ طائر فکر جو شاعری کے آسمان میں کرہ ہوا سے بھی آگے نکل جاتا، اب کی بار تارا بن کر چمکا۔ ایک ایک شعر الہامی روشنی سے منور تھا۔ جن لوگوں نے وہ نظم پڑھی۔ بالاجی کے فدائی ہو گئے۔ شاعر وہ شعبدہ باز ہے جس کی پٹاری میں بجائے سانپوں کے دل بند ہوتے ہیں۔

## تاریخ کا ایک ورق

ناظرین! بالا جی کے قومی کارنامے آپ کو تاریخ کے صفحوں میں آب زر سے لکھے ہوئے ملیں گے۔ ہم نے ان صفحات میں ان حالات اور واقعات کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ جس اس کارنامے کے محرک ہوئے۔

کسی گری ہوئی قوم کو ابھارنا بہت مشکل کام ہے۔ مگر اس کا صلہ بھی ساری دنیا کی دولت سے زیادہ گرانبار اور بیش قدر ہوتا ہے۔ بالا جی کے نام پر آج مورخ کا قلم وجد کرنے لگتا ہے۔ سعراء اس کے نام پر بلند پروازیوں کے موتی نثار کرتے ہیں۔ ملک کے در و دیوار اس کا جس گا رہے ہیں۔ اس کا ذکر کرتے ہی لوگوں کے سر تعظیم سے جھک جاتے ہیں اور دل قومی جوش سے لبریز ہو جاتے ہیں۔

کسی گری ہوئی قوم کو ابھارنا آسان کام نہیں مگر اس کا صلہ جنت کی نعمتوں سے بھی زیادہ حیات بخش ہوتا ہے۔ بچے ماں کی گود میں بالا جی کے کارنامے سنتے ہیں۔ اس کی یاد دلوں میں حوصلہ اور بازوؤں میں قوت پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے نام کی بستیاں بس رہی ہیں اور درسگاہیں کھل رہی ہیں۔ اس نام پر زبانیں فصاحت کے پھول چڑھا رہی ہیں۔ امراء اپنے محلوں اور غرباء اپنی جھونپڑیوں میں اس کے گن گاتے ہیں۔ اس کی صورت آنکھوں سے نہیں اترتی۔ اس کی پر زور اور پر حوصلہ آواز اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ اس کے خیالات آنے والی نسلوں کے دماغ سنواریں گے اور صدیوں تک اس کے ہم وطنوں کے لیے گنبد نور کا کام دیں گے۔

دیکھیے ایک بے یار و مددگار شخص قوم کو ابھارنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کام کے راستہ میں دولت کی اور مددگار کی کمی حائل نہیں ہو سکتی۔ روحانی قوت، دردمند دل، وسیع ہمدردیاں، یہ ضروری سامان ہے۔ ابھی بہت دن نہیں گزرے کہ پرتاپ چند ایک گمنام آدمی تھا۔ آج اس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ کیا اس کے پاس قارون کا خزانہ تھا۔ پنگھٹ پر جب عورتیں کولھوں پر گھڑے رکھے

پانی لینے آتی ہیں۔ تب بالا جی ہی کے چرچے ہوتے ہیں اور انہیں کے جس گائے جاتے ہیں۔ اناج کے کھیتوں میں انہیں کی بڑائی ہوتی ہے۔ یہی قومی خدمت گزاری کا انعام ہے۔

کلکتہ میں جب وہ گئے تو پھولوں کی برکھا ہوئی۔ ہزاروں من پھول پیروں تلے روند ڈالے گئے۔ اس دن مندروں میں دیوتاؤں کو پھول کی باس نہ ملی۔ رنگین مزاجوں کے گلے میں پھولوں کے گجرے نہ دکھائی دیئے اور حسینوں کی بجس پھولوں سے نہ سجائی جاسکیں۔ مگر بالا جی کو اس نمائش اور دھوم دھام سے مطلق دلچسپی نہ ہوئی۔ دوسرے دن جب وہ بھاگیرتھی کے کنارے پانی میں غروب آفتاب کی بہار دیکھ رہے تھے تو کئی عورتیں پانی بھرنے آئیں اور گھڑوں کو پانی میں گھما گھما کر باتیں کرنے لگیں۔

ایک نے کہا: ”بہن تو نے سنا نہیں بالا جی آئے ہیں“

دوسری بولی: ”ہمارے ایسے بھاگ کہاں جو ان کے درشن ملیں“

تیسری بولی: ”تو چلنے پر راضی ہو تو میں تیرے ساتھ چلوں، وہ آج اپنی گئو شالہ دیکھنے آئیں گے۔ کون دور ہے۔ مجھے گئوؤں کے لیے کھلی اور دانہ بھی لے جانا ہے۔ ایک پنتھ دو کاج ہو جائیں گے“

چوتھی بولی: ”ایسے دیوتا کے درشن کریں گی تو بڑا اپاپ ہوگا۔ دیکھ جب سے ان کا گئو شالہ کھلا ہے۔ بچوں کو دونوں وقت دودھ پینے کو مل جاتا ہے۔ نہیں تو روٹیوں کو ترستے تھے۔“

بالا جی نے یہ باتیں سنیں اور بھاگیرتھی کے گلنار پانی کی طرح چہرہ سرخ ہو گیا۔ انہوں نے گاؤں گاؤں گئو شالے کھول دیئے تھے۔ ان کا سدھانت تھا کہ ہماری قوم کی تباہی اور زوال کا اصلی سبب ہمارا جسمانی ضعف اور ذاتوں کی بے جا تفریق ہے۔ اور جب ہمارے بچے روکھی روٹیوں کو ترستے ہیں اور دودھ گھی کی تفریق خوشبو

بھی ان کے ناک تک نہیں پہنچتی تو کوئی تعجب نہیں کہ ان کے قویٰ ایسے ضعف اور ذاتوں کی ایسی بے جا تفریق، چہرے ایسے پژمردہ اور اعضا ایسے کمزور ہیں۔ بلند ارادے اور اونچے خیالات، چوڑے سینوں اور مضبوط کلائیوں میں رہا کرتے ہیں۔ جب قوائے جسمانی کا یہ حال ہے تو خیالات کیسے اڑیں۔ استقلال کہاں سے آئے۔ جرأت کہاں سے پیدا ہو اور پھول کیسے کھلیں۔ جب جڑ کو غذا نہیں پہنچتی تو پھل کہاں سے آئیں۔ جب پیڑ سوکھ جائیں تو زمین تر کر دو۔ اس میں پانس ڈال دو۔ پھر دیکھو کہ کیسے خوشنما اور خوشبودار پھل کھلتے ہیں۔ اور کیسے لذیذ اور رسیلے پھل لگتے ہیں، جسمانی صحت ضعف سے زیادہ مہیب قومی دشمن اور شرمناک ترقی کی حالت حقارت ہے۔ جس سے ہم اپنے بھائیوں کو دیکھتے ہیں۔ ہم نے اونچی اور نیچی ذاتیں مقرر کر رکھی ہیں اور فطرت کے اس زبردست قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں کہ خلقت ترقی کرتی ہوئی اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچتی ہے۔ آج تک جتنے رشی، مہاتما ہو گزرے ہیں ان سبھوں نے آریہ ورت سے اس تفریق کو مٹانے کی کوششیں کی ہیں۔ مہاتما بدھ وہ پہلے بزرگ تھے جنہوں نے ہندوؤں کی پیشانی پر سے اس بے انصافی اور ظلم کے داغ کو مٹانا چاہا اور انہیں بہت کچھ کامیابی ہوئی۔ ان کے بعد شری شنکر، شری رامانج، شری چیتن تھے۔

شری رام کرشن، سوامی دیانند جی اور سوامی رام تیرتھ سبھی مہاتماؤں نے یہی تعلیم دی کہ اپنے بھائیوں کو اپنا بھائی سمجھو۔ جاہل بھائی بھی تمہارا بھائی ہے۔ اسے حقیر مت سمجھو۔ تمہاری نجات اتفاق سے ہوگی، تفریق سے نہیں۔ جو شخص اپنے ہم وطنوں پر حقارت کی نگاہ ڈالتا ہے، وہ کبھی ترقی کے زینہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ پیارو! جب تک ایک برہم چمار کے سامنے سر تعظیم جھکانا نہ سیکھے گا، اس وقت تک قوم کی ناؤ ہرگز پار نہ لگے۔ یقین مانو تمہاری ناؤ جگہ سے ایک انگل بھی نہ ٹلے گی۔ تمہارے ڈانڈے ٹوٹ جائیں گے۔ تمہارے بادبان پھٹ جائیں گے اور تمہارے ملاح ہانپ ہانپ کر

بیدم ہو جائیں گے۔

یہ بالاجی کے خیالات ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ ورنہ ہندوستان کے لیے کیا کچھ نہ کر جاتے۔ تاہم جو کچھ انہوں نے کیا اس پر ہر ایک ہندوستانی فخر کر سکتا ہے۔ ایسا کون سا گاؤں ہے جہاں بالاجی کا گئوشالہ نہ قائم ہو۔ ہندوستان کی چپہ چپہ زمین کو انہوں نے اپنے قدموں سے روشن کیا۔ پونا، بمبئی، مدارس، میسور، کٹک، گجرات جیسے دور دراز شہروں میں مہینوں رہے اور اپنی بلند آواز سے سوئی ہوئی آتماؤں کو جگاتے رہے۔ چھ ہفتہ کی کوشش میں انہوں نے میسور میں تین ہزار گئوشالے کھلوا دیے۔ آفتاب کی چمک سے پانی میں ایسی چمک آجاتی ہے کہ آنکھیں نہیں ٹھہرتیں۔ بالاجی کا جوش اور حوصلہ دوسروں کو سرگرم، پر جوش اور حوصلہ مند بنا دیتا تھا۔ جہاں جہاں بالاجی نے گئوشالے قائم کیے، وہاں خود بخود اکھاڑے بن گئے۔ خم کی خوش آئند صدائیں صبح کو مبارکباد دیتی ہیں اور للکار کی پر جوش آوازیں درختوں کو نیند سے جاتی ہیں۔ ذات کی باہمی تفریق مٹانے کے لیے انہوں نے زبردست کوششیں کیں۔ وہ صفحہ تاریخ کے لیے ہمیشہ باعث ناز رہیں گی۔ وہ مبارک گھڑی تھی جب انہوں نے پٹنہ میں ارجن سبھا کی بنیاد ڈالی۔ تین سال کے اندر ایسا شاید ہی کوئی شہر یا گاؤں تھا جہاں ارجن سبھا کی شاخیں نہ کھلی ہوں۔ انہیں ارجن سبھاؤں کی کوششوں کا پھل ہے کہ آج ہر قصبہ میں نیچی ذاتوں کے لیے جدا جدا مدرسے۔ جدا جدا بورڈنگ ہاؤس قائم ہیں۔ ارجن سبھا کے ممبران مدرسوں میں تعلیم دیتے ہیں اور ان ذاتوں کے تمدن اور معاشرت کے عیوب کی اطلاع کرتے ہیں۔ یہ لوگ گاؤں گاؤں گھومتے ہیں اور ہندو قوم کے مظلوموں کو بیداری کا مژدہ سناتے ہیں۔ ان سے بھائیوں کی طرح بغلگیر ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں خودداری کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ مبارک اور جان بخش ہوتا تھا، وہ نظارہ جب بالاجی نے اپنے مظلوم بھائیوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر ان کا دل اور

حوصلہ بڑھانے کی باتیں کرتے ہیں۔آج بالا جی کا نام سن کر یہ لوگ پھولے نہیں سماتے تھے۔ان لوگوں میں اخلاق و عادات کو سدھارنے کی جو کوشش آپ دیکھتے ہیں۔یہ بالا جی ہی کی جانفشانیوں کا نتیجہ نیک ہے۔

ہمارے قومی کاموں کا ایسا کوئی جز نہیں ہے جو بالا جی کی عنایت کا ممنون نہ ہو۔ ان کا وقت، ان کا دھیان، ان کی سرگرمی اور ان کا سب کچھ قوم کی خدمت کے لیے وقف تھا۔وہ قوم کے سرتاج اور قوم کے چاکر دونوں ہی تھے۔

## 26

## بنارس میں آمد

جب سے شہرت نے برج رانی کو اپنا منظور نظر بنایا۔اس کے یہاں ہر دم عورتوں کا جمگھٹ لگا رہتا تھا۔شہر میں مستورات کی کئی سبھائیں تھیں۔ان کے متعلق سارا بوجھ اسی کو اٹھانا پڑتا۔اس کے علاوہ دوسرے شہروں سے اکثر عورتیں اس کی ملاقات کو آتی رہتی تھیں۔جو تیرتھ جاترا کرنے کے لیے بنارس آتا تھا وہ برجن سے ضرور ملاقات کو آتا تھا۔

برج رانی کے کلام کا مجموعہ بڑی آب و تاب سے شائع کیا تھا اور اس مجموعہ نے اس کی شاعرانہ سطوت کا ڈنکا بجا دیا تھا۔ہندوستان کا تو کیا شمار یورپ اور امریکہ کے سربرآور شعرا نے بھی اسے اس کے محاسن کلام پر مبارکباد دی۔ہندوستان میں شاید ہی ایسا کوئی خوش مذاق شخص ہوگا جس کی کتابوں کا شیلف اس دیوان سے آراستہ نہ ہو۔اور برجن کے کلام کی قدر کرنے والوں میں بالا جی کا درجہ سب سے بڑھا ہوا تھا۔وہ اپنی پر زور تقریروں اور تحریروں میں اسی کے کلام کی سندیں دیا کرتے تھے۔اور ایک بار سرسوتی میں اس کی پر زور تنقید لکھی تھی۔

ایک روز برجن صبح کے وقت بیٹھی ہوئی تھی کہ سیتا، چندکنور، رکمنی اور رانی آئیں۔ چندکنور زیوروں سے لدی ہوئی تھی۔سیتا متین اور خاموش، رکمنی کا چہرہ پژمردہ اور

الوداع شباب کی تصویر اور رانی ناک چوٹی سے درست عطر میں ڈوبی ہوئی تھی ۔چندرا نے ان عورتوں کو فرش پر بٹھایا اور ان کی خاطر مدارت کی ۔ برجن نے صبح کا وقت فکر سخن کے لیے مخصوص کر رکھا ہے ۔اس وقت وہ بلا کسی ضرورت کے سکھیوں سہیلیوں سے نہ ملتی جلتی تھی ۔باغیچہ میں ایک خوبصورت کنج تھا ۔چندرا نے ان عورتوں کو فرش پر بٹھایا اور ان کی خاطر مدارت کی ۔ برجن نے صبح کا وقت فکر سخن کے لیے مخصوص کر رکھا ہے ۔اس وقت وہ بلا کسی ضرورت کے سکھیوں سہیلیوں سے نہ ملتی جلتی تھی ۔ باغیچہ میں ایک خوبصورت کنج تھا ۔گلاب کی خوشبو سے بسی ہوئی ہوائیں آتی تھیں ۔ وہیں برجن ایک قالین پر بیٹھی ہوئی فکر سخن کیا کرتی تھی ۔اور بحر معنی سے جو وہ موتی نکالتی اسے مادھوی پرو یا کرتی ۔ آج بہت دنوں کے بعد اور اہل شہر کے متواتر تقاضوں پر برجن نے بالاجی پر قلم اٹھایا تھا ۔ بنارس ہی وہ شہر تھا جس کی یاد کبھی کبھی بالاجی کو بے چین کر دیا کرتی تھی ۔مگر باوجود اہل بنارس کے مسلسل دعوت اور اصرار کے انہیں بنارس آنے کی کبھی فرصت نہ ملی ۔سیلون اور رنگون تک گئے بنارس کی طرف رخ نہ کیا ۔اس شہر کو وہ امتحان کدہ سمجھتے تھے ۔اسی لیے آج برجن انہیں بنارس آنے کی دعوت دے رہی تھی ۔لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دعوت انہیں ضرور کھینچ لائے گی ۔ جب کوئی تازہ خیال آتا تو برن کا چاند سا چہرہ چمک اٹھتا ۔اور مادھوی کے چہرے پر سرخی کی جھلک آجاتی ۔باغیچہ میں گلاب کے بہت پھول کھلے ہیں ۔ رات کی شبنم میں نکھر کر وہ اس وقت بہت سہانے معلوم ہوتے ہیں ۔مگر اس وقت جو تازگی اور سہانا پن ان دونوں پھولوں پر ہے ، اسے دیکھ کر دوسرے پھول شرمائے جاتے ہیں ۔ دونوں پھول باغ فردوس کے پھول ہیں ۔

مگر نہیں ہم بھولتے ہیں ۔ایسے حسن دلآویز کو پھول سے کیا نسبت ، پھول میں وہ دلآویزی کہاں ۔وہ رس کہاں اور وہ کشش کہاں ۔کسی نے ایسا پھول دیکھا ہے جسے دیکھنے سے کبھی آنکھیں آسودہ نہ ہوں اور دیکھنے کی ہوس باقی رہے ۔ایسا پھول کہاں

ہے جسے دیکھ کر ایک بجلی سی کوند جائے۔ جس کی صورت دل پر نقش ہو جائے۔ شعراء نے پھول کا رتبہ بڑھا رکھا ہے۔ پھر کیا اس حسن کو چاند سے تشبیہ دیں آہ! یہاں بھی شاعروں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ چاند میں وہ دلفریبی کہاں۔ چاند میں روشنی ہے چمک ہے، مگر حسن کہاں۔ کیا چاند بھی ایسی چیز ہے جسے دیکھنے سے جی نہ بھرے۔ کیا چاند بھی جگر کو مسوسنے لگتا ہے۔ کیا چاند کو دیکھ کر بھی روح پر ایک نشہ سا چھا جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ حسن کی تشبیہ دنیا کی کسی چیز سے نہیں دی جاسکتی۔ کسی چیز میں یہ کشش، یہ اثر، یہ دلآویزی نہیں۔

نو بجتے بجتے برجن کمرہ میں آئی سیوتی بولی ''آج بڑی دیر لگا دی ہے''

برجن: ''گنتی نے سورج کو بلانے کے لیے کتنی تپسیا کی تھی''

سیتا: ''بالا جی بڑے ٹھر ہیں، میں تو ایسے آدمی سے کبھی نہ بولوں''

رکمنی: ''جس نے سنیاس لے لیا اسے گھر بار سے کیا ناطہ''

چندر کنور: ''یہاں آئیں گے تو میں منہ پر کہہ دوں گی کہ حضرت یہ معشوقانہ انکار کہاں سے سیکھا؟''

رکمنی: ''مہارانی رشی مہاتماؤں کا تو ادب کیا کرو، زبان کیا کترنی ہے؟''

چندر کنور: ''اورانہیں کب تک صبر کریں گے جی، سب جگہ جاتے ہیں یہیں آتے پیر تھکتے ہیں''

برجن: ''(مسکرا کر) اب بہت جلد درشن پاؤ گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس مہینہ میں ضرور آئیں گے''

ستیا: ''دھنیہ بھاگ کہ درشن تو ملیں گے۔ میں تو جب ان کا حال پڑھتی ہوں تو یہی جی چاہتا ہے کہ پا جاؤں تو گھنٹوں پاؤں پکڑ کر روؤں''

رکمنی: ''ایشور نے ان کے ہاتھ میں بڑا جس دیا۔ دارانگر کی رانی صاحبہ مر ہی چکی تھی۔ یقین مانو دم ٹوٹ رہا تھا کہ بالا جی کو خبر ہوئی۔ فوراً پہنچے اور دم کی دم میں اٹھا کر

بٹھا دیا۔ ہمارے منشی جی (شوہر) ان دنوں وہیں تھے۔ کہتے تھے کہ رانی جی نے خزانہ کی کنجی لے کر بالا جی کے پیروں پر رکھ دی اور کہا ''آپ اس کے مالک ہیں بابو جی نے خزانہ کی کنجی نہ لے کر کہا ''مجھے خزانہ درکار نہیں، آپ اپنی ریاست میں تین گئو شالے کھلوا دیجیے'' زبان سے نکلنے کی دیر تھی آج وارا انگر میں دودھ کی ندی بہتی ہے۔ایسا مہاتما کون ہوگا

چندر کنور: ''راجہ نولکھا کا تپ دق انہیں کی بوٹیوں سے چھوٹا۔ سارے حکیم ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ جب بالا جی چلنے لگے تو مہارانی صاحبہ نے نولکھ کا موتیوں کا ہار ان کے پیروں پر رکھ دیا۔ مگر اس کی طرف دیکھا تک نہیں''

رانی: ''عجیب مردہ طبیعت کے ہیں''

رکمنی: ''ہاں اور کیا، انہیں چاہیے تھا کہ ہار لیتے بلکہ گلے میں ڈال لیتے''

برجن: ''نہیں لے کر رانی کو پہنا دیتے کیوں سکھی؟''

رانی: ''ہاں میں اس ہار کے لیے غلامی لکھ دیتی''

چندر کنور: ''ہمارے یہاں تو ارجن سبھا کے ممبر بن بیٹھے ہیں۔ ڈھائی سو روپیہ لاکھ جتن کر کے جوڑا تھا۔ اسے اٹھا لے گئے کہ گھوڑا لیں گے، کیا ارجن سبھا والے بلا گھوڑے کے نہیں چلتے''

رانی: ''کل یہ لوگ قطار باندھ کر میرے مکان کے سامنے سے جا رہے تھے۔ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا''

اسی اثنا میں سیوتی تازہ خبر لائی

برجن: ''کوئی نئی خبر ہے؟''

سیوتی: ''ہاں بالا جی مانک پور آئے ہیں۔ ایک اہیر نے اپنی لڑکی کی شادی کا نوید بھیجا تھا، اس پر الہ آباد سے ارجن سبھا کے ممبروں کے ساتھ راتوں رات بانک پور پہنچے۔ اہیروں نے بڑے جوش سے خیر مقدم کیا۔ اور مل کر پانچ سو گائیں انہیں

بھینٹ دیں۔ بالا جی نے دلہن کو دعا دی اور دولہا کو گلے لگایا۔ پانچ اہیر ارجن سبھا کے ممبر بن گئے''

برجن: ''نہایت دلچسپ خبر ہے۔ مادھوی اسے کاٹ کر رکھ لینا اور کچھ؟''

سیوتی: ''پٹنہ کے باسیوں نے ایک ٹھاکردوارہ بنوایا ہے۔ پٹنہ کی ارجن سبھا نے بڑی دھوم دھام سے اس کا جلدہ کیا''

برجن: ''پٹنہ کے لوگ خوب سرگرمی سے کام کر رہے ہیں''

چندر کنور: ''کیا سوریں بھی اب سیندور پہنیں گی۔ باسی ٹھاکر دوارے بنوائیں گے''

رکمنی: ''کیوں وہ آدمی نہیں ہیں، ایشور نے انہیں نہیں بنایا۔ آپ ہی اپنے مالک کی پوجا کرنا جانتی ہیں''

چندر کنور: ''چلو ہٹو باسیوں سے مجھے ملاتی ہو، یہ مجھے اچھا نہیں لگتا''

رکمنی: ''ہاں تمہارا رنگ ذرا صاف ہے اور گہنے کپڑے سے لیس ہو۔ بس اتنا ہی فرق ہے کہ کچھ اور؟''

چندر کنور: ''اتنا ہی فرق کیوں ہے، زمین کو آسمان سے ملاتی ہو۔ میں پچھوا ہوں کے خاندان میں ہوں، معلوم ہے!''

رکمنی: ''ہاں معلوم ہے اور نہیں معلوم تھا تو اب معلوم ہو گیا۔ ٹھاکر صاحب کسی باسی سے بدبد کر کشتی لڑیں گے یا سر پر ٹیڑھی پگیا ہی رکھنا جانتے ہیں۔ میں تو جانتی ہوں کہ معمولی باسی بھی انہیں بغل میں دبا لے گا''

چندر کنور: ''منہ میں زبان دے جو چاہے کہہ لو، ہمارے باوا جے پور میں صوبیدار تھے۔ ہم لوگوں کی بیرتا دنیا میں مشہور ہے''

برجن: ''اچھا اب اس قضیہ کو جانے دو۔ تم دونوں جب آتی ہو لڑتی ہی آتی ہو''

ایک مہینہ اور گزرا۔ برجن کی تازہ نظم خیر مقدم کا پیغام لے کر بالا جی کے پاس پہنچی

مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ انہوں نے یہ دعوت قبول کی یا نہیں۔ اہل بنارس راہ دیکھتے دیکھتے تھک گئے۔ بالاجی روز بروز دکھن کی طرف بڑھتے جاتے تھے۔ آخر لوگوں کو مایوسی سی ہو گئی اور سب سے زیادہ مایوسی برجن کو ہوئی۔ ایک روز جب کسی کو سان و گمان بھی نہ تھا کہ بالاجی بنارس آ گئے۔

پران ناتھ نے آ کر کہا: ''بہن لو خوش ہو جاؤ، آج بالاجی تشریف لا رہے ہیں''

برجن کچھ لکھ رہی تھی کہ ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ مادھوی اٹھ کر دروازے کی طرف لپکی۔ پران ناتھ نے مسکرا کر کہا ''ابھی تھوڑے ہی آ گئے کہ یوں بے صبری ہوئی جاتی ہے''

مادھوی: ''کب آئیں گے ادھر ہی سے ہو کر جائیں گے نا؟''

پران ناتھ: ''یہی تو معلوم نہیں کدھر سے آئیں گے۔ انہیں جلوس اور دھوم سے نفرت ہے۔ اسی لیے پہلے سے آنے کی تاریخ نہیں مقرر کی۔ راجہ صاحب کے پاس آج صبح کو ایک آدمی نے آ کر خبر دی کہ بالاجی آ رہے ہیں اور کہا ہے کہ میرے استقبال کے لیے دھوم دھام نہ ہو۔ مگر یہاں بنارس کے لوگ اسے کب مانتے ہیں۔ استقبال ہو گا اور دھوم دھام کے ساتھ جلوس نکلے گا اور ایسا شاندار کہ شہر کی تاریخ میں یادرکھنے کے قابل، چاروں طرف آدمی چھوڑے ہوئے ہیں کہ جوں ہی انہیں آتے دیکھیں ہر ایک محلے میں ٹیلی فون سے خبر پہنچا دی جائے۔ کالج اور اسکولوں کے طلباء وردیاں پہنے بیرقین لیے اشارہ کے منتظر ہیں۔ گھر گھر پھول برسانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بازار میں دوکانیں سجائی جا رہی ہیں۔ شہر میں ایک ہلچل مچی ہوئی ہے۔''

مادھوی: ''ادھر سے جائیں گے تو ہم روک لیں گے''

پران ناتھ: ''ہم نے تو کوئی تیاری کی ہی نہیں۔ روک کیا لیں گے۔ اور یہ بھی تو نہیں معلوم کہ کدھر سے جائیں گے۔ رادھا چرن نے دھوکا دیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ امرتسر کی طرف سے ان کے آنے تک لوٹ آؤں گا اور ابھی تک ان کا کہیں پتہ نہیں

خیر''

برجن: ''(سوچ کر) آرتی اتارنے کا انتظام تو کرنا ہی ہوگا''

پران: ''ہاں اب کیا اتنا بھی نہ ہوگا۔ میں باہر فرش وغیرہ بچھواتا ہوں''

پران ناتھ باہر تیاریوں میں مصروف تھے۔ مادھوی پھول چننے لگی۔ برجن نے رو پہلا تھال دھو دھو کر صاف کیا۔ سیوتی اور چندر اندر سب چیزیں قرینہ سے رکھنے لگیں۔ مادھوی خوشی کے مارے پھولی نہ سما رہی تھی۔ بار بار چونک کر دروازہ کی طرف دیکھتی کہ کہیں وہ آ تو نہیں گئے۔ بار بار کان لگا کر سنتی کہ کہیں باجے کی آوازیں تو نہیں آ رہیں۔ دل مارے خوشی کے دھڑک رہا تھا۔ پھول چنتی تھی مگر دھیان دوسری طرف تھا۔ ہاتھوں میں کتنے ہی کانٹے چبھا لیے۔ پھول کے ساتھ کئی پیڑوں کی ٹہنیاں مروڑ ڈالیں۔ کئی دفعہ شاخوں میں الجھ کر گری۔ کئی دفعہ ساڑھی کانٹوں میں پھنسا دی۔ اس وقت اس کی حالت بالکل بچوں کی سی تھی۔

مگر برجن کا چہرہ بالکل اداس تھا۔ جیسے بھرا ہوا پیالہ ذرا سا ملنے سے بھی چھلک جاتا ہے، اسی طرح جوں جوں پرانی باتیں یاد آتی تھیں، اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے آہ! کبھی وہ دن تھے کہ ہم اور وہ بھائی بہن تھے۔ ساتھ کھیلتے تھے ساتھ رہتے تھے۔ یا آج سولہ سال گزر گئے ان کی صورت دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئی۔ تب میں ذرا بھی روتی تو وہ میرے آنسو پونچھتے اور میرا دل بہلاتے۔ اب انہیں کیا خبر کہ یہ آنکھیں کتنا روتی ہیں اور اس دل نے کیسے صدمے اٹھائے ہیں۔ کیا خبر تھی کہ ہماری قسمتیں ایسے گل کھلائیں گی۔ ایک بیوگن ہو جائے گی اور دوسرا سنیاسی۔

یکا یک مادھوی کو خیال آیا کہ سہاما کو شاید بالا جی کے آنے کی خبر نہ ہوئی ہو۔ برجن کے پاس آ کر بولی۔ ''بہن ذرا میں چچی کے یہاں جاتی ہوں، نہ جانے کسی نے ان سے کہا یا نہیں''

پران ناتھ باہر آ رہے تھے۔ یہ سن کر بولے ''وہاں سویرے ہی سب سے پہلے خبر

ہو گئی۔ خوب تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بالا جی بھی سیدھے گھر کی طرف ہی جائیں گے۔ ادھر سے اب نہ آئیں گے''

برجن: ''تو ہم لوگوں کو چلنا چاہیے۔ کہیں دیر نہ ہو جائے''

مادھوی: ''آرتی کا تھال لاؤ''

برجن: ''کون لے چلے گا مہری کو بلا لو (چونک کر) ارے یہ تیرے ہاتھ میں خون کہاں سے آیا؟''

مادھوی: ''اونہہ پھول چنتی تھی، کانٹے لگ گئے ہوں گے''

چندرا: ''ابھی تو نئی ساڑھی آئی ہے۔ آج ہی پھاڑ کے رکھ دی''

مادھوی: ''تمہاری بلا سے''

مادھوی نے یہ کہہ تو دیا مگر آنکھیں پر آب ہو گئیں۔ چندرا یوں بہت نیک عورت تھی مگر جب سے بابو رادھا چرن نے قومی خدمت کے لیے نوکری سے استعفیٰ دیا تب سے وہ بالا جی کے نام سے چڑتی تھی۔ برجن سے تو کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ مادھوی کو چھیڑتی رہتی تھی۔ برجن نے چندرا کی طرف گھور کر مادھوی سے کہا ''جاؤ صندوق سے دوسری ساڑھی نکال کر اسے رکھ آؤ رام رام مار کے ہاتھ چھلنی کر دیا''

''دیر ہو جائے گی میں یوں ہی چلوں گی''

''نہیں ابھی آدھ گھنٹہ سے زیادہ مہلت ہے''

یہ کہہ کر برجن نے پیار سے مادھوی کا ہاتھ دھویا۔ اس کے بال گوندھے۔ ایک خوبصورت ساڑھی پہنائی چادر اڑھائی اور اسے گلے سے لگا کر پر آب آنکھوں سے تاکتی ہوئی بولی ''بہن دیکھو دھیرج ہاتھ سے نہ جائے''

مادھوی مسکرا کر بولی ''تم میرے ساتھ ہی رہنا، مجھے سنبھالتی رہنا۔ مجھے اپنے آپ پر بھروسہ نہیں ہے''

برجن سمجھ گئی کہ آج پریم نے مدہوشی کا درجہ اختیار کیا۔ اور شاید یہی اس کی انتہا

ہے۔ آہ! یہ باولی بالو کی دیوار کھڑی کر رہی ہے۔

تھوڑی دیر میں مادھوی، برجن، سیوتی، چندر رائی عورتوں کے ساتھ سباما کے گھر کو چلیں۔ وہاں کی تیاریاں دیکھیں تو دنگ رہ گئیں۔ دروازہ پر ایک نہایت وسیع شامیانہ کھڑا تھا۔ فرش فرش اور شیشہ و آلات سے آراستہ نوبت جھڑ رہی تھی۔ بڑے بڑے ٹوکروں میں میوے اور مٹھائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ شہر کے روسائے نامدار خوش وضع لباس پہنے ہوئے استقبال کرنے کو کھڑے تھے۔ فٹن اور گاڑیاں ایک بھی نظر نہ آتی تھیں کیونکہ بالا جی ہمیشہ پیدل ہی چلا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ گلے میں جھولیاں ڈالے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ جن میں شاید بالا جی پر نثار کرنے کے لیے روپے پیسے بھرے ہوئے تھے۔ راجہ دھرم سنگھ کے پانچوں لڑکے رنگین کپڑے پہنے، زعفرانی صافے باندھے، ریشمی جھنڈے کمر میں کھونسے بجار بجا رہے تھے۔ جوں ہی لوگوں کی نظر برجن پر پڑی۔ ہزاروں سر فرط ادب سے خم ہو گئے۔ جب یہ خاتون اندر گئی تو وہاں بھی آنگن اور سائبان اور کمرے دلہن کی طرح سجے ہوئے پائے۔ صدہا عورتیں مبارکباد گانے کے لیے بیٹھی ہوئی تھیں۔ پھولوں کے ڈھیر بجا بجا پڑے ہوئے تھے۔ سباما ایک سفید ساڑھی پہنے صبر و الم کی تصویر بنی ہوئی دروازے پر کھڑی تھی۔ برجن اور مادھوی کو دیکھتے ہی آبدیدہ ہو گئی۔ برجن بولی ''چچی آج اس گھر کے بھاگ جاگے ہیں'' سباما نے رو کر کہا ''تمہاری بدولت مجھے آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے ایشور تمہیں اس کا پھل دے''

غم نصیب ماں کے تہہ دل سے یہ دعا نکلی۔ یک غم نصیب ماں کی بددعا نے رجاہ دشرتھ کو بیٹے کے فراق میں شربت مرگ چکھایا تھا۔ کیا سباما کی یہ دعا بے اثر رہے گی؟

دونوں ابھی اسی طرح باتیں کر رہی تھیں کہ گھنٹے اور ناقوسوں کی صدائیں آنے لگیں۔ شور مچا کی بالا جی آ پہنچے۔ عورتوں نے مبارکباد گانا شروع کیا۔ مادھوی نے

آرتی کا تھال لے لیا۔ اور راستہ کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگی۔ ذرا دیر میں وردی پوش نوجوانوں کی ایک جماعت نظر آئی۔ اس کے بعد ارجن سبھا کے ایک سو پچیس ممبر گھوڑوں پر سوار دکھائی دیئے۔ ان کے پیچھے بے شمار آدمیوں کا ہجوم تھا۔ سارا شہر پھٹ رہا تھا۔ شانے سے شانے چھل رہے تھے۔ سمندر کی ایک لہر تھی کہ بڑھتی چلی آتی تھی۔ اس ہجوم میں بالا جی کا چہرہ ایسا نظر آتا تھا، جیسے بادل سے چاند نکلا ہوا ہو۔ پیشانی پر سرخ چندن کا تلک تھا اور گردن میں گیروے رنگ کی چادر پڑی ہوئی تھی۔

سباما دروازے پر کھڑی تھی جوں ہی بالا جی کا چہرہ اسے نظر آیا ضبط ہاتھ سے جاتا رہا تھا۔

دروازہ سے باہر نکل پڑی اور سر جھکائے آنکھوں سے موتی پروتی بالا جی کی طرف چلی۔ آج اس نے اپنا کھویا ہوا لعل پایا ہے اور اسے گلے سے لگانے کے لیے بے قرار ہو رہی ہے۔

سباما کو اس طرح آتے دیکھ کر سب لوگ رک گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ سباما آسمان سے کوئی دیوی اتر آئی ہے۔ چوطرفہ سناٹا چھا گیا۔ بالا جی نے کئی قدم آگے بڑھ کر ماں کو پرنام کیا اور اس کے پیروں پر گر پڑے۔ سباما نے اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ اور ان کے ماتھے پر کئی بوسے دیئے۔ آج اس نے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے اس پر آنکھوں سے موتی برسا رہی ہے۔

اس روح افزا نظارے کو دیکھ کر لوگوں کے دل قومیت کے نشہ سے مدہوش ہو گئے۔ پچاس ہزار گلوں سے آواز آئی ''بالا جی کی جے'' بادل گرجا اور چاروں طرف سے پھولوں کی برکھا ہونے لگی۔ پھر اسی طرح گھن گرج کی صدا بلند ہوئی ''منشی سالگرام کی'' اور ہزاروں آدمی حب وطن کے نشہ سے مست ہو کر دوڑے اور سباما کے قدموں کی خاک پیشانی پر ملنے لگے۔ ان نعروں سے سباما ایسی خوش ہو رہی تھی جیسے مہور کے سننے سے ناگن متوالی ہو جاتی ہے۔ آج اس نے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے۔

اس بے بہار تن کے ملنے سے وہ رانی ہوگئی ہے۔اسی رتن کی بدولت آج اس کے قدموں کی خاک لوگوں کی آنکھوں کا سرمہ اور ماتھے کا چندن بن رہی ہے۔

عجیب حیات بخش نظارہ تھا بار بار جے جے کے نعرے بلند ہوتے تھے۔اور عالم بالا کے بسنے والوں کو بھارت بیداری کا مژدہ سناتے تھے۔ ماں اپنے بیٹے کو کلیجے سے لگائے ہوئے ہے۔بہت دن کے بعد آج اس نے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے۔وہ لال جو اس کے جنم بھر کی کمائی تھی پھول چاروں طرف نثار ہو رہے تھے۔زرو جواہر کی بارش ہو رہی تھی۔ماں اور بیٹا کمر تک پھولوں کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ایسا پر اثر سین کس کی آنکھوں نے دیکھا ہوگا۔

سباما، بالا جی کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف چلی، دروازہ پر پہنچتے ہی عورتیں مبارکباد گانے لگیں۔ مادھوی سنہرے تھال میں دھوپ، دیپ پھولوں سے آرتی اتارنے لگے۔ برجن نے پھولوں کی مالا ان کے گلے میں ڈال دی۔وہ مالا جسے مادھوی نے اپنے خون سے رنگا ہوا تھا۔بالا جی نے چشم پر آب سے برجن کی طرف دیکھ کر پرنام کیا۔

مادھوی کو بالا جی کے درشن کی آرزو تھی۔مگر اس وقت اس کی آنکھیں زمین کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ بالا جی کی طرف نہیں تاک سکی۔ اسے خوف ہے کہ میری آنکھیں بھید کھول دیں گی۔ان میں پریم رس بھرا ہوا ہے۔آج پہلی بار مادھوی کے دل میں نئی آرزوئیں پیدا ہوئی ہیں۔اب تک اس کی سب سے بڑی آرزو تھی کہ بالا جی کے درشن پاؤں مگر آج آرزوؤں نے سر ابھارا ہے پوری ہونے کے لیے نہیں، آج باغ حسرت میں ایک نئی کلی لگی ہے کھلنے کے لیے نہیں بلکہ مرجھانے کے لیے اور مرجھا کر خاک ہو جانے کے لیے مادھوی کو کون سمجھائے کہ تو ان آرزوؤں کو دل میں پیدا نہ ہونے دے۔ یہ آرزوئیں تجھے بہت رلائیں گی۔تیری محبت خیالی ہے۔تو اس کے مزے سے ناواقف ہے۔کیا اب واقعی محبت کا مزا لیا چاہتی ہے۔

27

## پریم کا سپنا

انسان کا دل آرزوؤں کا کاشانہ ہے اور حسرتوں کی بستی، کوئی زمانہ وہ تھا کہ مادھوی ماں کی گود میں کھیلتی تھی۔ اس وقت دل آرزوؤں اور حسرتوں سے خالی تھا۔ مگر جب مٹی کے گھروندے بنانے لگی تو اس وقت دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ میں اپنی گڑیا کا بیاہ کروں۔ سب لڑکیاں اپنی گڑیا بیاہ رہی ہیں۔ کیا میری گڑیا کنواری رہے گی۔ میں اپنی گڑیا کو گہنے بنوا دوں گی۔ اس کا بیاہ رچاؤں گی۔ اس آرزو نے اسے مہینوں رلایا مگر گڑیا کی قسمت میں بیاہ نہ بدا تھا۔ ایک روز بادل گھر آئے اور موسلا دھار پانی برسا۔ گھروندا اینہ میں بہہ گیا اور گڑیا کے بیاہ کی حسرت رہ گئی۔

کچھ دن اور گزرے۔ ماں کے ساتھ برجن کے گھر آنے جانے لگی۔ اس کی میٹھی میٹھی باتیں سنتی اور خوش ہوتی۔ اس کے تھال میں کھاتی اور اس کی گود میں سوتی۔ اس وقت بھی اس کے دل میں ایک آرزو تھی کہ میرا خوب اچھا گھر ہوتا۔ اس میں چاندی کے کواڑ لگے ہوتے۔ زمین ایسی صاف ہوتی کہ مکھی بیٹھے اور پھسل جائے۔ میں برجن کو اپنے گھر لے جاتی، وہاں اچھی اچھی چیزیں بناتی اور کھلاتی۔ اچھے سے پلنگ پر سلاتی اور اس کی خوب سیوا کرتی۔ یہ آرزو برسوں تک دل میں چٹکیاں لیتی رہی مگر اسی گھروندے کی طرح یہ گھر بھی ڈھے گیا اور آرزوئیں مبدل بہ حسرت ہو گئیں۔

کچھ دن اور گزرے۔ بہار کے دن آئے۔ برجن نے اس کے دل میں پرتاپ چند کی تصویر کھینچنی شروع کی۔ ان دنوں اس ذکر کے سوا کوئی بات اچھی نہ لگتی۔ آخر پرتاپ چند کی چیری بننے کی آرزو دل میں پیدا ہوئی۔ لیٹے لیٹے دل سے باتیں کیا کرتیں۔ راتوں کو جاگ جاگ کر سن کر مٹھائی کھاتی۔ ان خیالوں سے دل پر ایک نشہ سا ہو جاتا ہے مگر پرتاپ چند اسی اثنا میں لاپتہ ہو گئے۔ اور اسی مٹی کے گھروندے کی طرح یہ ہوائی قلعے بھی ڈھے گئے۔ آرزوؤں کی جگہ دل میں حسرتیں رہ گئیں۔

اب حسرتوں کے ہجوم سے دل میں آرزوؤں کی جگہ باقی نہ رہی۔ دیوتاؤں کی اپا سنا کرنے لگی۔ برت رکھنے لگی تا کہ پرتاپ چند پر زمانہ کی بری نگاہ نہ پڑے۔ اس طرح اس نے مدت تک تپسوئی کی زندگی بسر کی۔ خیال محبت کے نشہ میں چور رہتی۔ مگر آج تپسوئی کا برت ٹوٹ گیا اور دل میں نئی آرزوؤں نے سر اٹھایا۔ دس سال کی تپسیا ایک لمحہ میں بھنگ ہوگئی۔ کیا یہ آرزوئیں بھی مٹی کے گھروندے کی طرح پامال ہو جائیں گی۔

آج جب سے مادھوی نے بالا جی کی آرتی اتاری ہے اس کے آنسو نہیں تھمتے۔ سارا دن گزر گیا اور ایک ایک کر کے تارے نکلنے لگے۔ سورج تھک کر چھپ گیا۔ اور چڑیاں تھک کر گھونسلوں میں آ بیٹھیں۔ مگر مادھوی کی آنکھیں نہیں تھکتیں۔ وہ سوچتی کہ ہائے! کیا میں اسی لیے رونے کے لیے بنائی گئی ہوں میں کبھی ہنستی بھی تھی کہ جس کے بدلے اتنا روتی ہوں آہ! روتے روتے آدھی عمر گزر گئی۔ کیا یہ باقی دن بھی یوں ہی کٹیں گے۔ کیا میری زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہ آئے گا۔ جسے یاد کر کے تسکین ہو کہ میں نے بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔

آج سے پہلے مادھوی کبھی ایسی یاس زدہ اور شکستہ خاطر نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی خیالی محبت میں مخمور تھی۔ آج اس کے دل میں نئی آرزوئیں پیدا ہوئی ہیں۔ اور یہ آنسو انہیں کے کرشمے ہیں۔ جو دل سولہ برس تک حسرتوں کی آرام گاہ رہ چکا ہو وہی اس وقت مادھوی کے خیالات کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

سباما کے دل میں بھی آج نئی آرزوؤں نے سر ابھارا تھا۔ جب تک بالا جی کو دیکھا نہ تھا سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ایک نظر دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیتی۔ آج جب ایک نظر دیکھ لیا تو کچھ اور دیکھنے کی ہوس پیدا ہوئی۔ مگر افسوس مادھوی کے گھروندے کی طرح خاک میں مل جانے کے لیے۔

آج سباما، برجن اور بالا جی میں شام تک باتیں ہوتی رہیں۔ بالا جی نے اپنے

تجربات بیان کیے۔ سباما نے اپنی رام کہانی سنائی اور برجن نے بہت سنا۔ منشی سنجیون لال کے سنیاسی کی خبر پاکر دونوں روئیں۔ جب چراغ جلانے کا وقت آپہنچا تو بالا جی گنگا کی طرف چلے گئے۔ اور سباما، کھانا پکانے بیٹھی۔ آج کتنے دنوں کے بعد وہ من لگا کر کھانا پکارہی ہے۔

دونوں باتیں کرنے لگیں

سباما: ''میری یہ دلی لالسا تھی کہ میرا لڑکا دنیا میں نیک نام ہو اور ایشور نے میرے لالسا پوری کردی۔ پرتاپ نے باپ کا اور خاندان کا نام روشن کر دیا۔ آج جب سویرے پتی جی کی جے کے نعرے لگ رہے تھے تو میرا دل اُمڈ اُمڈ کر آتا تھا۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ وہ یہ ویراگ تیاگ دیں۔ دیش کا اپکار کرنے سے میں انہیں نہیں روکتی۔ میں نے یہی ور دیوی جی سے مانگا تھا۔ مگر انہیں سنیاس میں دیکھ کر میرا کلیجہ بیٹھا جاتا ہے''

برجن: سباما کا مطلب سمجھ گئی بولی ''چچی یہ بات تو میرے دل میں پہلے ہی جمی ہوئی تھی موقع پاتے ہی ضرور ذکر کروں گی''

سباما: ''موقع شاید ہی ملے۔ ان کا کون ٹھکانا۔ اسی وقت جی میں آوے کہیں چل دیں۔ سنتی ہوں سونٹا ہاتھ میں لیے اکیلے جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ مجھ سے اب بے چاری مادھوی کی دشا نہیں دیکھی جاتی۔ اسے دیکھتی ہوں تو جیسے کوئی میرے کلیجے کو کچلنے لگتا ہے۔ میں نے بہت سی عورتیں دیکھی ہیں اور ان بہتوں کا حال کتابوں میں بھی پڑھا ہے مگر ایسا پریم کہیں نہیں دیکھا۔ بے چاری نے آدھی عمر رو رو کر کاٹ دی ہے۔ اور کبھی منہ سے شکایت کا ایک لفظ نہیں نکالا۔ میں نے کبھی اسے روتے نہیں دیکھا۔ مگر رونے والی آنکھیں اور ہنسنے والے منہ چھپے نہیں رہتے۔ مجھے ایسی ہی بہو کی لالسا تھی۔ وہ بھی ایشور نے پوری کر دی۔ تم سے سچ کہتی ہوں میں اسے اپنی بہو ہی سمجھتی ہوں آج سے نہیں برسوں سے''

برج رانی: ''آج اسے دن بھر روتے دیکھا۔ بہت اداس دکھائی دیتی تھی''

سباما: ''تو آج اس کا ذکر چھیڑو، ایسا نہ ہو کل کسی طرف کی راہ لیں، پھر ایک جگ تک انتظار کرنا پڑے''

برج رانی: ''(غور کرکے) ذکر کرنے کو تو میں تیار ہوں مگر مادھوی خود خوبی سے یہ کام کرسکتی ہے۔ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا''

سباما: ''وہ بیچاری کیا کہے گی؟''

برج رانی: ''اس کی آنکھیں آپ ساری رام کہانی کہہ دیں گی''

سباما: ''وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے''

برج رانی: ''کہیں گے کیا؟ یہ تمہاری بھول ہے کہ تم مادھوی کو کنواری سمجھ رہی ہو۔ مدت گزری کہ وہ پرتاپ چند کی دلہن بن چکی ہے۔ ایشور کے یہاں اس کا بیاہ ان سے ہو چکا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا کیا دنیا آدمیوں سے خالی تھی۔ اپنی مادھوی جیسی عورت کو کون آنکھوں میں نہ بٹھائے گا۔ کیا اس نے اپنی آدھی جوانی مفت میں رو رو کر گنوائی ہے۔ اس نے آج تک کسی غیر شخص کو خیال میں بھی جگہ نہیں دی۔ بارہ برسوں سے تپسونی کی زندگی بسر کررہی ہے۔ وہ پلنگ پر نہیں سوئی۔ کبھی کوئی رنگین کپڑا نہیں پہنا۔ بال تک نہیں گوندھائے۔ کیا یہ سب باتیں نہیں کہتیں کہ مادھوی کا بیاہ ان سے ہو چکا ہے۔ دلوں کا ملاپ سچا بیاہ ہے سیندور کا ٹیکہ اور گٹھ بندھن اور بھانوریں یہ سب دنیا کے ڈھکوسلے ہیں''

''اچھا جیسا مناسب سمجھو کرو، میں صرف جگ ہنسائی سے ڈرتی ہوں''

رات کے نو بج گئے تھے۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ مادھوی باغیچہ میں اکیلی بیٹھی ہوئی تاروں کو دیکھتی تھی۔ اور دل میں سوچتی تھی کہ یہ دیکھنے میں کیسے چمکیلے ہیں مگر کتنی دور۔ کوئی وہاں تک پہنچ سکتا ہے؟ کیا میری امیدیں بھی انہی تاروں کی طرح ہیں؟ اتنے میں برجن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلا دیا۔ مادھوی چونک پڑی

برجن: ''اندھیرے میں بیٹھی کیا کر رہی ہے؟''

مادھوی: ''کچھ نہیں تاروں کو دیکھ رہی ہوں۔وہ کیسے خوشنما ہیں مگر مل نہیں سکتے۔

برجن کے کلیجہ میں برچھی لگ گئی۔ضبط کر بولی'' یہ تارے گننے کا وقت نہیں جس مہمان کے لیے آج سویرے تک پھولی نہیں سماتی تھی۔کیا اسی طرح اس کی مہمانداری کرو گی؟

مادھوی:''میں ایسے مہمان کی مہمانداری کرنے کے قابل کب ہوں؟''

برجن: ''اچھا یہاں سے اٹھو میں مہمانداری کرنے کا ڈھنگ بتاؤں گی''

یہ کہہ کر برجن نے مادھوی کا ہاتھ پکڑ لیا۔اور اٹھا دیا دونوں اندر آئیں۔سباما کھانا پکا چکی تھی۔بالا جی کو ماں جی کا بنایا ہوا کھانا آج مدتوں کے بعد ملا۔بڑی رغبت سے کھایا۔سباما کھلاتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔جب بالا جی کھا پی کر لیٹے تو برجن نے مادھوی سے کہا''اب یہاں کونے میں منہ ڈھانپ کر کیا کر رہی ہو؟''

مادھوی: ''کچھ دے دو کھا کے سو رہوں اب یہی جی چاہتا ہے''

برجن: ''مادھوی ایسی نراش نہ ہو کیا اتنے دنوں کا برت ایک دن میں بھنگ کر دے گی؟''

مادھوی اٹھی مگر دل بیٹھا جاتا تھا۔جیسے بادلوں کی کالی کالی گھٹائیں اٹھتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جل تھل ایک ہو جائے گا۔مگر یکا یک پچھوا ہوا چلنے لگتی ہے۔اور سارے بادل کائی کی طرح پھٹ جاتے ہیں۔اسی طرح بالکل اس وقت مادھوی کے دل کی کیفیت ہو رہی ہے۔

یہ مبارک دن دیکھنے کی آرزو اس کے دل میں کتنے دنوں سے تھی۔کبھی وہ دن آئے گا کہ میں ان کے درشن کروں گی اور امرت کی سی باتیں سنوں گی۔اس دن کے لیے اس نے کیسی منتیں مانی تھیں۔اس دن کے خیال ہی سے اس کا دل کیسا کھل اٹھتا تھا۔

آج صبح مادھوی بہت خوش تھی۔ اس نے بڑے شوق سے پھولوں کا ہار گوندھا تھا۔ سینکڑوں کانٹے ہاتھ میں چبھا لیے۔ متوالوں کی طرح گرتی پڑتی تھی۔ یہ سب خوشی اور نشہ اسی لیے تو تھا کہ آج وہ مبارک دن آ گیا۔ جس کی طرف مدت سے آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ زمانہ بھی اب یاد نہیں۔ جب یہ آرزو دل میں نہ رہی ہو مگر اس وقت مادھوی کے دل کی کیفیت نہیں۔ خوشی کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ غالباً وہ مادھوی کی خوشی کی انتہا تھی۔ جب وہ باغیچہ میں جھوم رہی تھی کہ پھولوں سے آنچل بھر رہی تھی۔ جس نے کبھی خوشی کا مزہ نہ چکھا ہو اس کے لیے اتنی ہی خوشی کا معراج کامرانی تھی۔ وہ غریب اس سے زیادہ خوشی کا بوجھ سنبھال سکتی تھی۔ جب ہونٹوں پر کبھی ہنسی ہی نہیں آئی ان کا مسکرانا ہی ہنسی ہے۔ تم اپنے سے زیادہ ہنسنے کی امیدیں کیوں رکھتی ہو۔ مادھوی بالا جی کی طرف چلی۔ مگر اس طرح نہیں جیسے ایک نئی نویلی دلہن۔ ارمانوں سے بھری ہوئی سنگھار کیے اپنے پتی کے پاس جاتی ہے۔ یہی کمرہ تھا جسے وہ اپنے دیوتا کا مندر سمجھتی تھی۔ جب مندر خالی تھا تب وہ آ آ کر اس میں آنسوؤں کے پھول چڑھاتی تھی۔ آج جب دیوتا نے باس کیا ہے تو وہ یوں کیوں مچل مچل کر آ رہی ہے۔

رات خوب بھیگ چکی تھی۔ سڑک پر سے گاڑیوں کی گھنٹیوں کی آوازیں کان میں آ رہی تھیں۔ مادھوی دبے پاؤں بالا جی کے کمرہ کے دروازہ تک گئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اندر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ کسی نے پیر تھام لیے۔ وہ الٹے قدم لوٹ آئی اور زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ اس کے دل نے کہا مادھوی! یہ بڑے شرم کی بات ہے تو بالا جی کی چیری ہی۔ مانا کہ تجھے ان سے پریم ہے مگر تو ان کی دلہن نہیں ہے۔ تجھے اس وقت ان کے کمرہ میں قدم رکھنا ہرگز مناسب نہیں۔ تیرا پریم تجھے ان کی پتنی نہیں بنا سکتا۔ پریم اور چیز ہے۔ سہاگ اور چیز ہے پریم دل کا جھکاؤ ہے اور بیاہ ایک پاک فرض ہے۔ تب مادھوی کو ایک بیاہ یاد آیا۔ دولہے نے بھری سبھا میں دلہن کی بانہہ پکڑی تھی۔ اور کہا تھا کہ اس استری کو میں اپنے گھر کی مالکہ اور اپنے دل کی

دیوی سمجھتا رہوں گا۔ اس سبھا کے لوگ، آکاش، اگنی اور دیوتا اس کے گواہ رہیں گے۔ آہ! کیسے مبارک الفاظ ہیں۔ مجھے بھی کبھی یہ الفاظ سننے نصیب ہوں گے۔ میں نہ اگنی کو اپنا ساکشی بنا سکتی ہوں، نہ دیوتا کو، نہ آکاش کو۔ مگر اے اگنی، اے آکاش کے تارو، اے دیولوک کے باسیو تم شاہد رہنا کہ مادھوی نے بالا جی کی پاک صورت کو دل میں جگہ دی ہے۔ مگر کسی ناپاک خیال کو دل میں نہ آنے دیا۔ اگر میں نے کمرہ کے اندر قدم رکھا ہو تو اے اگنی اسی وقت مجھے جلا کر راکھ کر دینا اے آکاش! اگر تو نے اپنی ہزار آنکھوں سے مجھے کمرہ میں جاتے دیکھا ہو تو اسی دم مجھ پر اندر کا بجر گرا دے۔

مادھوی کچھ دیر تک انہیں خیالات میں ڈوبی بیٹھی رہی۔ یکا یک اس کے کان میں بھک بھک کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر دیکھا تو بالا جی کا کمرہ بہت زیادہ روشن ہو گیا تھا۔ اور کھڑکیوں سے روشنی نکل کر باہر آ رہی صحن میں پھیل رہی تھی۔ مادھوی کے پیروں تلے سے مٹی نکل گئی۔ معاً خیال گزرا کہ میز کا لیمپ بھبک اٹھا۔ ہوا کی طرح وہ بالا جی کے کمرے میں گھسی۔ دیکھا تو لیمپ پھٹ کر زمین پر گر پڑا ہے۔ اور فرش میں تیل کے پھیل جانے سے آگ لگ گئی ہے۔ دوسرے کنارے بالا جی آرام سے سو رہے ہیں۔ ابھی تک ان کی نیند نہیں کھلی تھی۔ انہوں نے قالین سمیٹ کر ایک کونے میں رکھ دیا تھا۔ بجلی کی طرح لپک کر مادھوی نے یہ قالین اٹھا لیا اور اسے شعلوں کے اوپر گرا دیا۔ دھماکے کی آواز ہوئی تو بالا جی نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ کمرہ میں دھواں بھرا ہوا تھا اور چاروں طرف تیل کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ واقعہ کی صورت سمجھ گئے بولے ''بڑی خیریت ہوئی ورنہ کمرہ میں آگ لگ گئی تھی''

مادھوی: ''جی ہاں ذرا لیمپ گر پڑا تھا''

بالا جی: ''تم بڑے موقع سے آ پہنچیں۔ کیسے معلوم ہوا تمہیں؟''

مادھوی: ''میں یہیں باہر بیٹھی تھی''

بالا جی: ''تم کو بڑی تکلیف ہوئی۔ اب جا کر سو جاؤ، رات زیادہ ہوگئی ہے''

مادھوی: ''چلی جاؤں گی، سونا تو روز ہے یہ موقع نہ جانے پھر کب آئے''

مادھوی کی آواز میں غضب کا درد تھا۔ بالا جی نے اس کی طرف غور سے یکھا۔ اٹھارہ سال پہلے انہوں نے مادھوی کو دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ایک کھلتی ہوئی کلی تھی۔ اور آج ایک مرجھایا ہوا پھول۔ نہ چہرہ تازگی۔ نہ آنکھوں میں روشنی، نہ مانگ میں سہاگ کا ڈورا تھا اور نہ ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ۔ جسم پر زیوروں کا نشان بھی نہ تھا۔ بالا جی نے قیافہ سے سمجھا کہ بدھاتا نے عین شباب میں اس دکھیا کا سہاگ ہر لیا ہے۔ بہت مغموم ہوکر بولے'' کیوں مادھوی تمہارا بیاہ تو ہو گیا ہے''

مادھوی کے کلیجہ میں چھری اتر گئی۔ آبدیدہ ہوکر بولی ''جی ہاں ہو گیا ہے''

''بالا جی: اور تمہارا پتی؟''

مادھوی: ''نہیں کچھ میری سدھ ہی نہیں۔ ان کا بیاہ مجھ سے نہیں ہوا'' بالا جی متحیر ہو کر بولے'' تمہارا پتی کیا کرتا ہے؟''

مادھوی: ''دیش کی سیوا''

بالا جی کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا، مادھوی کا مطلب سمجھ گئے پوچھا'' مادھوی! اس بیاہ کو کتنے دن ہوئے؟''

''مجھے کچھ یاد نہیں بہت دن ہوئے شاید اٹھارہ بیس سال''

بالا جی کی آنکھیں پر آب ہوگئیں۔ اور چہرہ پر قومی غرور کا نشہ سا چھا گیا۔ بھارت ماتا! آج اس گئے گزرے زمانہ میں بھی تمہاری گود میں ایسی ایسی دیویاں کھیل رہی ہیں جو ایک خیال پر زندگی اور جوانی کی آرزوئیں قربان کرسکتی ہیں بولے'' ایسے پتی کو تیاگ کیوں نہیں دیتیں؟''

مادھوی نے بالا جی کی طرف پر غرور نگاہوں سے دیکھا بولی ''سوامی جی! آپ اپنی زبان سے ایسا نہ فرمائیں۔ میں ہندو عورت ہوں۔ میں نے گاندھاری اور ساوتری

کے کل میں جنم لیا ہے۔ جسے ایک بار دل سے اپنا پتی مان چکی اسے نہیں تیاگ سکتی۔ اگر میری زندگی یوں ہی روتے روتے کٹ جائے تو بھی اپنے پتی کی طرف سے ملال نہ ہوگا۔ جب تک میرے تن میں جان رہے گی، میں ایشور سے ان کی بھلائی چاہتی رہوں گی۔ میرے لیے یہی کیا کم ہے کہ ایسے مہاتما کے پریم نے میرے دل میں باس کیا ہے۔ میں اسی کو اپنا سوبھاگیہ سمجھوں گی۔ آج اٹھارہ سال سے زیادہ ہوا کہ میں نے بناؤ سنگھار کا خیال دل میں نہیں آنے دیا۔ میں نے ایک بار اپنے سوامی کو دور سے دیکھا تھا۔ اور وہ تصویر ایک دم کے لیے بھی میری نگاہوں سے نہیں اتری۔ جب کبھی میں بیمار ہوئی ہوں، اسی تصویر نے میری تیمارداری کی ہے۔ جب کبھی میں نے بیوگ کے دکھ سے بے چین ہوکر آنسو بہائے ہیں اسی تصویر نے مجھے ڈھارس دیا ہے۔ اس پتی کو میں تیاگ دوں۔ میں ہمیشہ اس کی ہوں اور ہمیشہ اسی کی رہوں گی۔ میرا دل اور میری جان اس کے نذر ہو چکے ہیں۔ اگر وہ کہے تو آج میں آگ کی گود میں ایسی خوشی سے جا بیٹھوں گویا پھولوں کی سیج ہے اگر میری جان اس کے کام آئے تو میں خوشی سے دے دوں گی۔ جیسے کوئی اپاسک دیوتا پر پھول چڑھا دیتا ہے۔''

مادھوی کا چہرہ خوشی سے گلگوں ہو رہا تھا بالا جی نے اس کی باتیں سنیں اور دم بخود ہو گئے۔ یہ وہ عورت ہے جس نے میرے خیال پر اپنی زندگی قربان کر دی۔ اس خیال سے بالا جی کی آنکھیں پرآب ہو گئیں۔ جس پریم میں ایک عورت نے اپنی زندگی جلا کر خاک کر دی ہو۔ اس کے لیے ایک آدمی کے استقلال کو جلا کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ پریم کے مقابلے میں ضبط کوئی چیز نہیں ہے بولے ''مادھوی تم جیسی دیویاں بھارت کے لیے مایہ ناز ہیں۔ میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ تمہارے پریم جیسی انمول چیزیں میرے ہاتھ آ رہی ہے۔ اگر تم نے میرے لیے جوگن بننا پسند کیا ہے تو میں بھی تمہارے لیے اس سنیاس اور ویراگ کو خیرباد کہہ سکتا ہوں۔ جس کے لیے تم نے

اپنے تئیں مٹا ڈالا ہے، وہ تمہارے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے نہ ہچکچے گا‘‘

مادھوی نے فوراً جواب دیا۔ وہ اس جواب کے لیے پہلے سے تیار تھی ’’سوامی جی! میں بہت کمزور اور بے عقل عورت ہوں۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ذاتی آرام کا خیال آج تک ایک لمحہ کے لیے بھی میرے دل میں نہیں آیا۔ مگر آپ نے یہ خیال کیا کہ میرے پریم کا معراج صرف یہ ہے کہ آپ کے پیروں میں سنسار کے بندھنوں کی بیڑیاں ڈال دوں تو (ہاتھ جوڑ کر) آپ نے اس کی حقیقت بالکل غلط سمجھی ہے۔ میرے پریم کا معراج صرف وہی ہے، جو آج کا دن مجھے حاصل ہو گیا ہے۔ آج کا دن میری زندگی کا سب سے مبارک دن ہے۔ آج میں اپنے پران ناتھ کے ساتھ کھڑی ہوں اور اپنے کانوں سے ان کی امرت سی باتیں سن رہی ہوں۔ سوامی جی! مجھے امید نہ تھی کہ زندگی میں مجھے یہ دیکھنا نصیب ہوگا۔ اگر میرے پاس دنیا کا راج ہوتا تو میں اس خوشی میں اسے آپ کے قدموں پر نثار کر دیتی۔ میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے منت کرتی ہوں کہ مجھے اپنے چرنوں سے الگ نہ کیجیے گا۔ میں سنیاس لے لوں گی اور آپ کے ساتھ رہوں گی۔ میرا ویراگن بنوں گی۔ بھبھوت رماؤں گی۔ مگر آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گی، پران ناتھ۔ میں نے بہت دکھ سہے ہیں مگر اب یہ جلن نہیں سہی جاتی‘‘

یہ کہتے کہتے مادھوی کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں سے پریم کی دھارا بہنے لگی۔ اس سے وہاں بیٹھا نہ گیا۔ اٹھ کر پرنام کیا اور برجن کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ برج رانی نے اسے گلے لگالیا اور پوچھا ’’کیا بات چیت ہوئی؟‘‘

مادھوی: ’’جو تم چاہتی تھیں‘‘

برج رانی: ’’سچ؟ کیا بولے؟‘‘

مادھوی: ’’یہ نہ بتاؤں گی‘‘

برج رانی کو گویا بڑی دولت مل گئی بولی ’’ایشور نے بہت دنوں میں حوصلہ پورا کیا۔

میں اپنے یہاں سے بیاہ کروں گی'' مادھوی مایوسانہ انداز سے مسکرائی۔ برجن نے کانپتی آواز میں کہا ''ہم کو بھول تو نہ جائے گی'' اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر آواز سنبھال کر بولی ''تو تم ہم سے اب بچھڑ جاؤ گی''

مادھوی: ''میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی''

برجن: ''چل باتیں نہ بنا''

مادھوی: ''دیکھ لینا''

برجن: ''دیکھا ہے جوڑا کیسے پہنے گی؟''

مادھوی: ''سفید جیسے بگلے کا پر''

برجن: ''سہاگ کا جوڑا کیسریے رنگ کا ہوتا ہے''

مادھوی: ''میرا اجلا ہی رہے گا''

برجن: ''تجھے چندر ہار بہت پسند ہے۔ میں اپنے دے دوں گی''

مادھوی: ''ہار کی جگہ کنٹھی دے دینا''

برجن: ''کیسی باتیں کر رہی ہے؟''

مادھوی: ''اپنے سنگھار کی''

برجن: ''تیری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ تو اس وقت اتنی اداس کیوں ہے۔ تو نے اس رتن کے لیے کیسی کیسی باتوں کی تپسیا کی، کیسا کیسا جوگ سادھا، کیسے کیسے برت رکھے اور آج تجھے جب وہ رتن مل گیا تو خوش نہیں دکھائی دیتی''

مادھوی: ''تم بیاہ کی بات چیت کرتی ہو، اس سے مجھے صدمہ ہوتا ہے''

برجن: ''یہی تو خوش ہونے کی بات ہے''

مادھوی: ''بہن میرے بھاگ میں وہ خوشی لکھی ہی نہیں۔ جو چڑیا بادلوں میں گھونسلا بنانا چاہتی ہے، وہ سدا ڈالیوں پر رہے گی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ زندگی کے یہ چند سال اسی طرح پریم کا سپنا دیکھنے میں کاٹ دوں''

## الوداع

دوسرے دن بالا جی اشنان دھیان سیف ارغ ہو کر راجہ دھرم سنگھ کا انتظار کرنے لگے۔ آج رات گھاٹ پر ایک عظیم الشان گئوشالہ کی بنیاد پڑنے والی تھی۔ شہر کے کوچہ و بازار مسکراتے نظر آتے تھے۔ سڑک پر دو رویہ بیرقیں اور جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ سڑکیں نہا دھو کر اپنا سینہ فرش راہ کیے ہوئے تھیں۔ دروازے پھولوں کی مالا گلے میں ڈالے خیر مقدم کرنے کے لیے تیار تھے۔ کیونکہ آج حبیب وطن کی آمد ہے۔ جس نے اپنا سب کچھ وطن پر قربان کر دیا۔

خوشی کی دیوی اپنی سکھیوں، سہیلیوں کے ساتھ محو خرام تھی۔ ہوا مستی سے جھومتی پھرتی تھی۔ رنج و غم کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ جا بجا نوبت جھڑ رہی تھی۔ مرد خوش وضع لباس زیب تن کیے اٹھلاتے تھے۔ عورتیں سولہوں سنگھار کیے منگل گیت گا رہی تھیں۔ لڑکے زعفرانی صافے باندھے کلیلیں کرتے تھے۔ ہر مرد و زن کے چہرے سے خوشی جھلک رہی تھی۔ کیوں آج قوم کے ایک سچے جان نثار کی آمد ہے۔ جس نے اپنا سب کچھ قوم کی نذر کر دیا ہے۔

بالا جی جب اپنے جاں نثار رفیقوں کے ساتھ راج گھاٹ کی طرف چلے تو سورج نے گوشہ مشرق سے نکل کر استقبال کیا۔ ان کا مردانہ چہرہ جوں ہی لوگوں نے دیکھا۔ ہزاروں زبانوں سے بھارت کی جے کا پر جوش نعرہ نکلا اور فضائے آسمان کو چیرتا ہوا گنبد گردوں تک جا پہنچا۔ گھنٹے اور ناقاس کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اور مسرت سے دلآویز نغمے ہوا میں گونجنے لگے۔ جس طرح شمع کو دیکھتے ہی پروانے اس پر نثار ہونے کو ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اسی طرح بالا جی کو دیکھ کر لوگ بڑی تیزی سے ان کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ ارجن سبھا کے سوا سو ممبروں نے سلام کیا۔ ان کی خوشنما وردیوں اور سبک خرام گھوڑے نظروں میں کھبے جاتے تھے۔ اس جماعت کا ایک

ایک ممبر قوم کا سچا جان نثار تھا۔ اور ان کے پر جوش نعرے لوگوں کے دلوں کے حوصلہ سے لبریز کیے دیتے تھے۔ سڑک کے دونوں کنارے تماشائیاں کا ہجوم تھا۔ نوبتیں جھڑ رہی تھیں۔ پھول اور میوے برس رہے تھے۔ جا بجا شہر کی للتائیں سنگھار کیے ہوئے، سنہرے تھالوں میں کافور، پھول اور صندل لیے آرتی اتار رہی تھیں۔ دو کانیں عرس زیبا کی طرح آراستہ تھیں۔ سارا شہر رشک چمن بنا ہوا تھا۔ اور جس طرح ساون کے مہینہ میں کالی گھٹائیں اٹھتی ہیں۔ اور رہ رہ کر رعد کی گھن گرج صدا دلوں کو ہلا دیتی ہے، اسی طرح اس خلقت بے پایاں کی زبانوں سے بھارت کی جے کے حوصلہ خیز آوازیں دلوں میں گرمی اور ولولہ پیدا کر رہی تھیں۔ جب بالا جی چوک میں پہنچے تو ایک عجیب نظارہ دیکھا پانچ سو نوعمر لڑے اودھے کے لیس دار کوٹ پہنے، زعفرانی رنگ کے پیچدار صافے باندھے اور ہاتھوں میں خوبصورت سونٹ لیے سر راہ کھڑے تھے۔ بالا جی کو دیکھتے ہی وہ دس دس کی قطاروں میں ہو گئے۔ اور اپنے ڈنڈے بجا بجا کر یہ پر اثر گیت گانے لگے۔

بالا جی تیرا آنا مبارک ہوئے
دھن دھن بھاگ ہیں اس نگری کے
دھن دھن بھاگ ہمارے
دھن دھن اس نگری کے باسی
جہاں تیرے چرن پدھارے
بالا جی تیرا آنا مبارک ہوئے

کیسا دلکش نظارہ تھا۔ نغمہ اگرچہ سادہ تھا۔ مگر متعدد اور موزوں آوازوں نے مل کر اسے بلا کا دلکش اور پر اثر بنا دیا۔ لوگوں کے قدم وہیں جم گئے اور چوطرفہ سناٹا چھا گیا۔ خموشی میں یہ ترانہ ایسا ہی سہانہ معلوم ہوتا تھا جیسے رات کے سناٹے میں نغمہ عندلیب سارا عالم نقش حیرت بنا کھڑا تھا۔ غریب بھارت باسیو! تم نے ایسے

نظارے کہاں دیکھے۔ اس وقت خوب سیر ہو کرت دیکھ لو۔ تم رقاصان دلنواز کی نغمہ سرائیوں سے آسودہ ہو گئے۔ حسینوں کی نازک ادائیاں بہت دیکھ چکے۔ گل وگلشن کی بہت سیریں کیں۔ مگر وہ مسرت علوی وہ حوصلہ طرب خیز جو اس وقت تم محسوس کر رہے ہو، تمہیں کہیں اور بھی حاصل ہوا تھا۔ رقاصان دلنواز کے نغمے اور حسینوں کی نازک ادائیاں اور گل وگلشن کی سیریں تمہارے نفس کو خوش کرتی ہیں۔ مگر تمہارے حوصلوں کو پست اور کمزور بنا دیتی ہیں۔ لیکن ایسے نظام تم میں قومیت اور قومی جوش اور قومی ہمدردی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اگر تم نے اپنی زندگی میں ایک بار بھی یہ نظارہ دیکھا ہے تو اس کا پاک نقش تمہارے دلوں سے کبھی نہ مٹے گا۔

بالاجی کا وجیہ چہرہ روحانی مسرت کی روشنی سے منور ہو رہا تھا اور آنکھوں سے سچے قومی کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ جس طرح کسان اپنے لہلہاتے ہوئے کھیت کو دیکھ کر خوشی سے متوالا ہو جاتا ہے، وہی کیفیت اس وقت بالاجی کی تھی۔ جب نغمہ بند ہو گیا تو انہوں نے چند قدم آگے بڑھ کر دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو اٹھا کر اپنے کندھوں پر بٹھایا اور عالم مستی میں زور سے ایک نعرہ لگایا ''بھارت ماتا کی جے''

اس طرح لوگ خراماں خراماں راج گھاٹ پہنچے۔ یہاں گئو شالہ کی ایک شاندار بفلک عمارت استقبال کے لیے کھڑی تھی۔ صحن میں مخملی فرش بچھایا تھا۔ محرابیں، ستون اور دروازے خوشنما پھولوں اور پتیوں سے سجے ہوئے تھے۔ مکان کے اندر کئی ہزار گائیں بندھی ہوئی تھیں بالاجی نے اپنے ہاتھوں سے ان کی ناندوں میں کھلی اور بھوسہ ڈالا۔ انہیں پیار سے تھپکیاں دیں۔ ایک وسیع کمرہ میں سنگ مرمر کا مثمن حوض بنا ہوا تھا۔ دودھ سے لبریز، بالاجی نے ایک چلو دودھ لے کر آنکھوں سے لگایا اور پی گئے۔ اس کے بعد ہزاروں آدمی اس چشمہ آب حیات سے فیض یاب ہوئے۔

ابھی صحن میں لوگ اطمینان سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ کئی آدمی بدحواس دوڑے

ہوئے آئے اور کہا کہ پنڈت بدلو شاستری سیٹھ اتم چند اور لالہ مکھن لال باہر کھڑے غل مچا رہے ہیں کہتے ہیں کہ ہم کو بالا جی سے دو دو باتیں کر لینے دو۔ بدلو شاستری، بنارس کے نامی گرامی پنڈت تھے۔ خوبصورت ہلالی تلک لگاتے۔ سبز بانات کے مرزائی پہنتے اور بسنتی پگڑی باندھتے تھے۔ اتم چند اور لالہ مکھن لال دونوں شہر کے رئیس اعظم اور لکھ پتی آدمی تھے۔ خطاب کے لیے ہزاروں لاکھوں روپے خرچ کرتے اور اعلیٰ عہدیداروں کی تواضع اور تکریم و خاطر و مدارات فرض اولین سمجھتے تھے۔ ان حضرات کا شہر کے آدمیوں پر بڑا دباؤ تھا۔ بدلو شاستری جب کبھی شاستر ارتھ کرتے تو یہ یقینی بات تھی کہ فریق ثانی کی خیریت نہیں۔ خصوصاً بنارس کے پنڈے اور پراگوال اور اسی قبیل کے دوسرے مفت خور تو ان کے پسینہ کی جگہ خون بہانے کو تیار تھے۔ شاستری جی بنارس میں سناتن دھرم کے وکیل اور رکن اعظم مشہور تھے۔ اتم چند اور مکھن لال بھی مذہبی جوش و خروش سے لبریز تھے۔ اس وقت ان کی تشریف آوری فتنہ انگیزی سے کم نہ تھی۔ سناتن دھرم کا فرض اولین تمدن کے نقائص حمایت کرنا ہے اور چونکہ بالا جی کی روز افزوں کامیابیوں کو دیکھ کر ان کے کلیجے پر سانپ لوٹا رہتا تھا۔ اور یہ لوگ عرصہ سے بالا جی کے ساتھ شاستر ارتھ کرنے یا با الفاظ دیگر فوجداری کرنے کا موقع ڈھونڈ رہے تھے۔ آج ان کی دلی مرادیں بر آئیں۔ پنڈوں اور پراگوالوں کی ایک جمعیت کثیر لے کر آ پہنچے۔

بالا جی نے ان مہاتماؤں کے آنے کی خبر سنی تو باہر نکل آئے۔ مگر یہاں کی کیفیت دیکھی تو ہوش اڑ گئے۔ طرفین کے لوگ لاٹھیاں سنبھالے آستین چڑھائے گتھنے کو تیار تھے۔ شاستری جی پراگوں کو وار کرنے کے لیے للکار رہے تھے اور سیٹھ جی بلند میں آواز فرما رہے تھے کہ ان شودروں کی دھجیاں اڑا دو۔ ہم عدالت میں دیکھ لیں گے تمہارا بال بیکا نہ ہونے پائے گا۔ مکھن لال صاحب بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر فرماتے تھے کہ نکل آئے جس میں بوتا ہو۔ ایک ایک کو سبز باغ دکھا دوں گا۔ بالا جی نے جب

یہ رنگ دیکھا تو راجہ صاحب سے بولے ''آپ بدلوشاستری کو جا کر سمجھا دیجیے کہ اس شر وفساد سے باز آئیں۔ ورنہ طرفین کا نقصان ہوگا اور جگ ہنسائی الگ ہوگی'' راجہ صاحب کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے بولے ''اس شخص سے بات کرنا میں اپنی توہین سمجھتا ہوں اسے پراگوالوں کی جمعیت پر غرور ہے۔ مگر میں آج ان کی ساری شیخی کرکری کیے دیتا ہوں۔ ان کا منشا بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ آپ پروار کریں مگر جب تک میں اور پانچوں بیٹے زندہ ہیں، کوئی آپ کی طرف آنکھ نہیں اٹھا سکتا۔ بس آپ کے ایک اشارہ کی دیر ہے اور میں دم کی دم میں انہیں اس شرارت کا مزہ چکھا دوں گا''

بالا جی سمجھ گئے کہ یہ شیر بھر گیا ہے اس سے مصالحت کی امید رکھنی فضول ہے۔ راجپوت کی طرح بالا جی کے آنے سے مخالفین کی یہ فوج منتشر ہو گئی۔ کتنے ہی آدمیوں نے جو شر وفساد کی نیت سے آئے تھے، فرط عقیدت سے بالا جی کے روبرو سر جھکایا۔ اور ان کے عقیدت مندوں کے زمروں میں شامل ہو گئے۔ بدلوشاستری نے ہر چند چاہا کہ پنڈوں کے تعصب کو مشتعل کریں۔ مگر ناکام رہے۔

اس وقت بالا جی نے ایک نہایت پر زور تقریر کی جس کا ایک ایک لفظ آج تک سننے والوں کے دلوں میں منقوش ہے اور جو اہل ہند کے لیے ہمیشہ مشعل کا کام کرے گا۔ بالا جی کو یوں تو بہت سی تقریریں ہیں مگر وہ جوش، وہ شعلہ اور وہ بلندی جس سے وہ تقریر مرصع ہے، ان کی کسی تقریر میں نظر نہیں آتی۔ انہوں نے جادوئے کلام کے زور سے چند لمحوں میں پنڈوں کو اہیروں اور پاسیوں سے گلے ملا دیا۔ اس جادو صفت تقریر کے یہ آخری الفاظ تھے۔

''اگر آپ مستقل مزاجی سے کام کرتے چلے جائیں تو ضرور ایک دن آپ کو منزل مقصود کا سنہرا مینار دکھائی دے گا مگر استقلال کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دینا استقلال اور طاقت ہی زبردست قوت ہے۔ استقلال مردانہ خوبیوں کا بادشاہ ہے۔ استقلال

اور صاف دلآوری کا جوہر ہے۔ اسے ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ تمہارے سامنے آزمائشیں آئیں گی۔ تمہیں متواتر مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ناکامیاں تمہاری عناں گیر ہوں گی۔ ایسی حالتوں میں سوائے استقلال کے تمہارا کوئی قابل اعتماد رہنما نہ ہوگا۔ استقلال اگر کامیاب نہ بھی ہو سکے تو دنیا میں اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے۔"

جب بالا جی مکان کی طرف چلے تو آفتاب گوشہ مغرب میں چھپ رہا تھا۔ انہیں چوک کی رونق اور زندہ دلی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آج شہر والوں نے اس حبیب وطن کی آمد کی مبارکباد میں شہر کو چراغاں کرنے کی تیاریاں کی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف محرابیں بنائی جا رہی تھیں۔ چوراہوں پر رفیع الشان پھاٹک کھڑے تھے۔ اور دکانوں پر جھاڑ فانوس اور ہانڈیاں زیب دے رہی تھیں۔ اس عام مسرت کے جوش میں لوگ اپنے ذاتی دکھڑے بھول گئے تھے۔ مگر اتفاقات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ مسرت کے یہ سارے سامان درہم برہم ہو گئے۔ بالا جی نے مکان پر پہنچ کر اخبار کھولا تو چہرہ زرد ہو گیا اور دل دردمند سے ایک ٹھنڈی سانس نکل آئی۔

راجہ صاحب نے گھبرا کر پوچھا "خیریت تو ہے؟"

بالا جی: "سدیا میں طوفان آ گیا اور دریا کا باندھ پھٹ پڑا۔ دس ہزار آدمی تباہ ہو گئے۔ جب بپھرتا ہے تو اسے مرنے مارنے کے سوائے اور کوئی خیال نہیں رہتا بولے "راجہ صاحب آپ دور اندیش ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ آگے بڑھ کر اپنے آدمیوں کو روکیے ورنہ نتیجہ بہت برا ہوگا"

بالا جی یہ کہتے کہتے رک گئے۔ سمندر کی لہروں کی طرح لوگ ادھر ادھر سے امڈتے چلے آتے تھے۔ ہاتھوں میں لاٹھیاں اور آنکھوں میں خون کی سرخی۔ چہرے غضب ناک۔ تیوروں پر بل پڑے ہوئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے یہ جماعت کثیر پراگوالوں کے سر پر پہنچ گئی اور قریب تھا کہ لاٹھیاں سروں کا بوسہ لیں۔ اور سنگینیں کلیجوں میں

پہنچیں کہ بالاجی بجلی کی طرح کوند کر ایک گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اور نہایت پرزور لہجہ میں فرمایا۔

"بھائیو! یہ کیا اندھیر ہے۔ اگر مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو، تو فوراً ہاتھ نیچے کرلو۔ اور پیروں کو ایک انچ آگے مت بڑھنے دو۔ مجھے فخر ہے کہ تمہارے دلوں میں مردانہ غصہ اور جوش ہے۔ مگر مردانہ ضبط اس سے بھی زیادہ پاک اور مقدس ہے۔ اس وقت اپنے غصہ کو ضبط سے روکو۔ کیا تم اپنی قوم کے ساتھ کل فرائض ادا کر چکے کہ یوں جان دینے پر آمادہ ہو۔ کیا تم مشعل لے کر بھی کنوئیں میں گرنا چاہتے ہو۔ یہ لوگ تمہارے دشمن نہیں۔ تمہارے بھائی تمہارے ہی خون ہیں۔ انہیں اپنا دشمن مت سمجھو! اگر وہ جاہل ہیں تو ان کی جہالت کو دور کرنا تمہارا فرض ہے۔ اگر وہ تمہیں گالیاں دیں تو تم برا مت مانو۔ اگر وہ تم سے لڑنے پر آمادہ ہوں تم سلامت روی اختیار کرو۔ اور ایک ہوشیار حکیم کی طرح اپنے بدمزاج مریضوں کے علاج کرنے میں مصروف رہو۔ میں نے تم کو باآواز بلند منع کر دیا۔ اگر میرے حکیم کے خلاف تم نے ہاتھ اٹھایا تو وہ قوم کا دشمن ہوگا"

ان پرزور الفاظ نے چوطرفہ سکوت کا عالم طاری کر دیا۔ جو جہاں تھا وہیں نقش بہ دیوار بن گیا۔ اس ایک شخص کی آواز میں قیامت کا اثر تھا۔ جس نے پچاس ہزار آدمیوں کے اٹدتے ہوئے جوش کو فرو کر دیا۔ جیسے کوئی ہوشیار کوچبان شریر گھوڑے کو روک لیتا ہے۔ اور یہ طاقت کس نے دی تھی؟ نہ اس کے سر پر تاج شاہی تھا، نہ وہ کسی فوج کا سپہ سالار تھا۔ یہ صرف اس پاک اور قومی بے غرض خدمت کا جذبہ تھا جو اس نے سرانجام دیا تھا۔ خادم قوم کے اعزاز و امتیاز کا پیمانہ وقربانیاں ہوتی ہیں جو وہ اپنی قوم کے لیے کرتا ہے۔

پنڈوں اور پراگوالوں نے بالاجی کی پرجلال صورت دیکھی اور پرزور آواز سنی تو ان کا جوش بھی سرد ہو گیا جس طرح آفتاب کے نکلتے ہی کہرا پھٹ جاتا ہے۔

دھرم سنگھ: ''اف!''

بالا جی: ''ہزاروں آدمی سیلاب میں بہہ گئے۔ سارا شہر مسمار ہو گیا۔ مکانوں کی چھتوں پر کشتیاں چل رہی ہیں۔ ارجن سبھا کے لوگ پہنچ گئے ہیں۔ اور حتی الوسع آدمیوں کو تباہ ہونے سے بچا رہے ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے''

دھرم سنگھ: ''(چشم پر آب ہو کر) یا ایشور تو ان غریبوں کا مالک ہے''

بالا جی: ''گوپال گئوشالہ بہہ گیا ہے۔ ایک ہزار گائیں سیلاب کی نذر ہو گئیں۔ تین گھنٹہ لگاتار مینہ برستا رہا 16 انچ پانی گرا۔ شہر کے جنوبی حصہ میں ساری آبادی جمع ہے۔ نہ رہنے کو مکان ہے نہ کھانے کو دانہ لاشوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ بھوکوں مرے جاتے ہیں اور لوگوں کے نالہ وشیون سے کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے۔ سب مصیبت زدہ آدمی بالا جی کو بلانے کی رٹ لگا رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میرے پہنچنے سے مصیبتیں رفع ہو جائیں گی''

تھوڑی دیر تک بالا جی آنکھیں بند کیے گہرے خیال میں ڈوبے بیٹھے رہے۔ بعد ازاں بولے ''میرا جانا ضروری ہے۔ میں اسی وقت جاؤں گا آپ سدیا کے ارجن سبھا کو تار دے دیجئے کہ وہ اس کام میں میرا ہاتھ بٹانے کو تیار رہیں''

راجہ صاحب نے منت آمیز لہجہ میں کہا ''ارشاد ہو تو میں بھی ساتھ چلوں''

بالا جی: ''میں وہاں پہنچ کو آپ کو اطلاع دوں گا۔ میرے خیال میں آپ کے جانے کی ضرورت نہ ہوگی''

دھرم سنگھ: ''بہتر ہوتا آپ علی الصباح جاتے''

بالا جی: ''جی نہیں مجھے یہاں لمحہ بھر ٹھہرنا مشکل گزر رہا ہے۔ ابھی مجھے وہاں تک پہنچنے میں کئی دن لگیں گے''

دم کے دم میں سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ سدیا میں طوفان آ گیا۔ اور بالا جی اسی وقت جا رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی ہزاروں آدمی بالا جی کو رخصت کرنے کے لیے

نکل پڑے۔ اور نو بجتے ہی دروزہ پر قربان پچیس ہزار آدمیوں کا مجمع ہو گیا۔ سدیا کی خبر ہر کس کی زبان پر تھیں۔ لوگ ان مصیبت زدوں کی حالت پر افسوس و ہمدردی کر رہے تھے۔ صدہا آدمی بالا جی کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اور سدیا والوں کی امداد کے لیے ایک فنڈ کھولنے کے چرچے ہو رہے تھے۔

ادھر رانی دھرم سنگھ کے محل میں شہر کی خواتین نے آج سباما کو مبارکباد دینے کے لیے ایک جلسہ کیا تھا۔ عالیشان حویلی کا ایک ایک گوشہ عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ پہلے برج رانی نے کئی عورتوں کے ساتھ ایک مبارکباد کا سہانا گیت گایا۔ اور اس کے بعد سب عورتیں حلقہ باندھ کر گاتی بجاتیں، آرتی کا تھال لیے سباما کے مکان پر آئیں۔ سیوتی اور چندرا مہمانوں کا مصافحہ کرتے ہوئے پہلے ہی موجود تھیں۔ سباما ہر ایک خاتون سے گلے ملی۔ اور انہیں دعا دی کہ تمہاری گود میں بھی ایسے ہی سپوت بچے کھیلیں گے۔ پھر رانی صاحبہ نے اس کی آرتی اتاری اور گانا ہونے لگا۔ آج مادھوی کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ کل کی طرح آج وہ مایوس و مغموم نہ تھی۔ آرزوئیں بس کی گانٹھ ہیں۔ انہیں آرزوؤں نے کل سے اتنا رلایا تھا مگر اس کا دل ان آرزوؤں سے خالی ہو گیا ہے۔ اسی لیے چہرہ شگفتہ اور آنکھیں روشن ہیں۔ بے آرزو رہ کر اس دیوی نے ساری زندگی کاٹ دی۔ مگر با آرزو رہ کر اس سے ایک دن کا دکھ بھی نہ جھیلا گیا۔

سہانے راگوں کے الاپ سے مکان گونج رہا تھا کہ یکا یک سدیا کی خبر یہاں بھی پہنچی اور راجہ دھرم سنگھ یہ کہتے ہوئے سنائی دیئے آپ لوگ بالا جی کو رخصت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں وہ اسی وقت سدیا جا رہے ہیں

یہ سنتے ہی آدھی رات کی سی خاموشی چھا گئی۔ سباما گھبرا کر اٹھی اور دروازہ کی طرف لپکی۔ گویا وہ بالا جی کو روک لے گی۔ اس کے ساتھ سب کی سب عورتیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔ برج رانی نے کہا ''چچی! کیا انہیں زبردستی

رخصت کرو گی ابھی تو وہ اپنے کمرے میں ہیں''

سباما: ''میں انہیں نہ جانے دوں گی رخصت کرنا کیسا؟''

برج رانی: ''ان کا سدیا جانا ضروری ہے''

سباما: ''میں سدیا کیا لے کر چاٹوں گی، بھاڑ میں جائے، آخر میں بھی تو کوئی ہوں، میرا ابھی تو ان پر کوئی حق ہے''

برج رانی: ''تمہیں میری قسم اس وقت اس قسم کی باتیں نہ کرنا ہزاروں آدمی محض ان کے بھروسے پر جی رہے ہیں یہ نہ جائیں گے تو قہر ہو جائے گا''

محبت مادرانہ انسانیت اور قومیت کے احساس سے غالب آ گئی۔ مگر برج رانی نے سمجھا کہ روک لیا۔ سباما اس واقعہ کو یاد کر کے ہمیشہ افسوس کرتی تھی۔ اسے تعجب ہوتا تھا کہ میں آپے سے باہر کیوں ہو گئی تھی

رانی صاحبہ نے پوچھا ''برجن بالا جی کو جے مالا کون پہنائے گا''

برجن: ''آپ''

رانی صاحبہ: ''اور تم کیا کرو گی؟''

برجن: ''میں ان کے ماتھے پر تلک لگاؤں گی''

رانی صاحبہ: ''مادھوری کہاں ہے؟''

برجن: ''(آہستہ سے) اسے نہ چھیڑو بیچاری اپنے خیال میں مگن ہے''

اسی اثناء میں بالا جی باہر نکلے۔ انہیں دیکھتے ہی لوگوں نے پر جوش نعرہ مارا بھارت کی بے عورتیں بھی ان کی طرف بڑھیں۔ بالا جی نے سباما کو دیکھا تو نزدیک آ کر اس کے قدم چوم لیے۔ سباما نے انہیں اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر وفور جذبات نے زبان نہ کھلنے دی۔ رانی صاحبہ پھولوں کی جے مالا لے کر چلیں کہ ان کے گلے میں ڈال دوں۔ مگر پیر تھرائے۔ اور آگے نہ بڑھ سکیں۔ برج رانی چندن کا تھال لے کر چلی۔ مگر آنکھیں ندی کی طرح امڈ آئیں۔ اور دل بیٹھ گیا۔ تب مادھوی

چلی۔ اس کی آنکھوں میں پریم کی چمک تھی اور چہرے پر پریم کی سرخی، ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ اور دل پریم کے نشہ میں مگن تھا۔ اس نے بالا جی کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جو اتھاہ محبت سے لبریز تھیں اور تب سر نیچا کر کے پھولوں کی جے مالا گلے میں ڈال دی۔ ماتھے پر چند کا ٹیکہ لگایا اور پریم کا بیڑا ہاتھ میں دے دیا۔ مراسم ظاہری کی کسر تھی وہ بھی پوری ہوگئی۔ اس وقت بالا جی نے گہری سانس لی۔ اورانہیں معلوم ہوا کہ میں پریم کے اتھاہ سمندر میں بہا جا رہا ہوں۔ ضبط اکھڑ گیا اور اس شخص کی طرح جو یکایک پانی میں پھسل پڑا ہو انہوں نے بے اختیار مادھوی کی بانہہ پکڑ لی مگر آہ! جس تنکے کا انہوں نے سہارا لیا وہ خود پریم کی دھارا میں تیزی سے بہا جا رہا تھا۔ ان کا ہاتھ پکڑتے ہی مادھوی کے رگ رگ میں بجلی سی کوندگئی۔ بدن میں پسینہ آگیا اور جس طرح ہوا کے جھونکے سے پنکھڑیوں پر جمیل ہوئے شبنم کے قطرے زمین پر گر پڑے ہیں۔ اسی طرح مادھوی کی آنکھوں سے آنسو کی بوندیں بالا جی کے ہاتھ پر پڑیں۔ یہ پریم کے موتی تھے۔ جوان متوالی آنکھوں سے بالا جی کے بھینٹ کیے۔ آج سے یہ آنکھیں پھر نہ روئیں گی۔ آسمان پر تارے چمکے ہوئے تھے۔ اوران کی آڑ میں بیٹھی ہوئی دیویاں یہ نظارہ دیکھ رہی تھیں آج صبح بالا جی کے خیر مقدم میں یہ نغمہ گایا جا رہا تھا۔

بالا جی تیرا آنا مبارک ہوئے

اوراس وقت عورتیں اپنے دلکش اور من بھاونے سروں میں گارہی تھیں

بالا جی تیرا جانا مبارک ہوئے

آنا بھی مبارک تھا اور جانا بھی مبارک ہے۔ آنے کے وقت بھی آنکھوں سے آنسو نکلے تھے اور جانے کے وقت بھی آنسو نکل رہے ہیں۔ کل وہ مہمان کا خیر مقدم کرنے کے لیے آئے تھے۔ آج اسے الوداع کر رہے ہیں۔ ان کا رنگ روپ بالکل یکساں ہے، مگران میں کتنا فرق ہے۔

## متوالی جوگن

مادھوی پہلے ہی مرجھائی ہوئی کلی تھی۔ حسرت نے اسے خاک میں ملا دیا۔ بیس سال کی تپسونی جوگن بن گئی۔ اس غریب کی بھی کیا زندگی تھی کہ یا تو دل میں کوئی آرزو پیدا ہی نہیں ہوئی، ہوئی تو قسمت نے اسے پھلنے پھولنے نہ دیا۔ اس کا پریم عشق کا دریائے بے کنار تھا۔ اس میں ایسا سیلاب آیا کہ زندگی کی آرزوئیں اور حسرتیں فنا ہو گئیں۔ اس نے جوگنوں سے وستر پہن لیے اور علائق اور حسرتیں فنا ہو گئیں۔ دنیا انہی ارمانوں اور آرزوؤں کا دوسرا نام ہے۔ جس نے انہیں گور حسرت میں دفن کر دیا۔ اسے دنیا سمجھنا بھول ہے۔

اس پریم کے نشہ میں متوالی جوگن کو ایک قیام نہ تھا۔ بوئے گل کی طرح دیش دیش بچرتی اور پریم کے شبد سناتی پھرتی تھی۔ اس کے زرد چہرے پر گیروے رنگ کی کفنی بہت سہانی معلوم ہوتی تھی۔ یہ پریم کی مورت کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے۔ جب وہ اپنی بین پر کوئی بھجن گانے لگتی تو سننے والوں کے دل پریم اور انوراگ سے سرشار ہو جاتے۔ اس کا ایک ایک شبد پریم رس میں ڈوبا ہوا تھا۔

متوالی جوگن کو بالا جی کے نام سے عشق تھا۔ وہ اپنے پدوں میں اکثر ان کی کیرت سناتی تھی۔ جس دن سے اس نے جوگیا بھیس اور لوک لاج کو پریم پر نچھاور کر دیا، اسی دن سے گویا سرسوتی اس کی زبان پر بیٹھ گئیں۔ اس کے رسیلے پد سننے کو لوگ سینکڑوں کوس سے چلے آتے تھے۔ جس طرح بنسی کی صدا سنتے ہی گوپیاں گھروں سے بےقرار ہو کر نکل پڑتی تھیں۔ اسی طرح اس جوگن کی تان سنتے ہی انسانوں کا دریا اٹڈ پڑتا۔ اس کے پد سننا آنند کے پیالے پینا تھا۔

اس جوگن کو کسی نے ہنستے یا روتے نہیں دیکھا۔ اسے نہ کسی بات کا رنج تھا۔ نہ کسی بات کی خوشی، جس دل میں آرزوئیں نہ ہوں وہ کیوں ہنسے اور کیوں روئے۔ اس کا

چہرہ آنند کی تصویر تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی دیکھنے والوں کی آنکھیں پاک سرور سے لبریز ہو جاتی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆

---------- اختتام ----------------